اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

جولائی ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۱۸ء/شوال ۱۴۳۹ھ

مشمولات

تعلیم، تحقیق، تربیت، تزکیۂ نفس

O فکرونظر/تعلیم وتحقیق

- لہو خورشید کا ٹپکے | مدیر | ۴
- اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق | سید ابوالاعلیٰ مودودی | ۵

O تعلیم وتربیت

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم | ڈاکٹر ذاکر حسین | ۱۴

O تزکیۂ نفس

- رمضان ابتداء ہے، انتہاء نہیں | محمد ندیم اعوان | ۲۰

اسلام، پاکستان اور مغرب

O اسلام اور پاکستان

- جمہوریت، پاکستان اور اسلامی نظام | پروفیسر طارق بٹ | ۲۲
جمہوریت کی اسلامائزیشن ممکن نہیں
- ہمارے سیاسی نظام کی بوالعجبیاں | مدیر | ۳۲
دفعہ ۶۲ پر عمل درآمد سے گریز
- دینی سیاسی قوتوں کے لیے نئے لائحہ عمل کی تلاش | حامد کمال الدین | ۳۴
- اقتدار میں آئے بغیر بھی اصلاحات ممکن ہیں | سید خالد جامعی | ۳۷

O عالم اسلام

شام - ماضی، حال اور مستقبل | محمد ندیم اعوان | ۴۳

O دریچے

پڑھتا جا شرماتا جا | نقیب سحر | ۵۴

O تبصرۂ کتب

محمد متین خالد، موسیٰ بھٹو اور مختار فاروقی صاحب کی کتابوں پر مختصر تبصرہ | مدیر | ۵۷

فکرونظر/تعلیم وتحقیق

لہوخورشید کا ٹپکے

ہمارے جس عبقری شاعر نے یہ کہا تھا کہ ؎ لہوخورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں تو اپنے تخیل کی بلند پروازی کا اظہار وہ شعر کی صورت میں ہی کرسکتا تھا کیونکہ وہ ایک شاعر تھا۔ اگر وہ ایک سائنسدان ہوتا اور اس کے پاس ایک بڑی آراستہ معمل (Well equipped laboratory) ہوتی تو بلاشبہ وہ آئن سٹائن سے بہت پہلے ایٹم بم ایجاد کرچکا ہوتا۔

اصل سوال اس فرد کے ٹیلنٹ کا نہیں اس تہذیبی Modus Operandi کا ہے کہ اس نے اپنے ورلڈ ویو کے مطابق افراد کو فکروعمل کی کیا ترجیحات عطا کیں۔ اسی عبقری شاعر نے اس گرہ کی کشاد بھی کردی ہے ؎

میَں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے؟ شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

تو کیا یہ زوال کی علامت نہ تھی کہ ہمارے شہنشاہ محبت کرتے اور محبوبہ کے مقبرے تعمیر کراتے رہے (اگرچہ اس میں بھی ان کا ذوق اتنا عمدہ تھا کہ ’تاج محل‘ آج اس شہنشاہ کے مرنے کے صدیوں بعد بھی ایک عجوبۂ عالم ہے) جس پر ہمارے ایک دوسرے شاعر کو کہنا پڑا کہ ؎

اِک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے، جو اپنی درخشاں تہذیب کو گہن لگانے کے مجرم ہیں، اپنی روش، غلامی کے بہت سے ذلت آمیز دھکے کھانے کے باوجود آج بھی بدلی تو نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی پورے عالم اسلام میں امریکہ ویورپ کی لیبارٹریوں کے پائے کی ایک بھی لیبارٹری موجود نہیں ہے اور ہمارے فکری طور پر غلام حکمران، غلام دانشور اور غلام عوام مغرب کی پرانی ہونے والی ٹیکنالوجی بطور کنزیومر استعمال کرکے آج بھی اس طرح اکڑ کر چلتے ہیں جس طرح لنڈے کا سوٹ پہنے ایک لاہور یا کلف لگے کالر کی (فرضی) گرد جھاڑتے ہوئے ٹائی سیدھی کرتے ہوئے اکڑ کر چلتا ہے گویا اس نے کشمیر فتح کرلیا ہو۔ اور کسی کو ہوش نہیں ہے کہ اگر ہم زندہ قوم ہوتے تو اپنی ٹیکنالوجی خود پیدا کرتے نہ کہ غالب الحادی تہذیب کے علمبرداروں کی پرانی ٹیکنالوجی بطور End user استعمال کرتے! تو ہے کوئی جو سوچے؟

تحقیق سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق
نوعیت، مقاصد اور ترجیحات

[مولانا مودودیؒ نے ۲۲ /اپریل ۱۹۶۳ء کو جماعت کے علمی و تحقیقی ادارے ُادارۂ معارف اسلامی ٗ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر مولانا نے جو تقریر کی اسے ادارۂ معارف اسلامی، کراچی ''علمی تحقیقات کیوں اور کس طرح'' کے عنوان سے ایک بروشر کی صورت میں طبع کرتا آرہا ہے۔ البرہان میں کچھ عرصہ سے اسلامی علوم میں دائرہ ہائے تحقیق کے زیرِ عنوان راقم اور بعض دوسرے احباب کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ مولانا کا مذکورہ خطاب بھی درحقیقت اسی موضوع پر ہے لہٰذا ہم نے البرہان میں اس کی اشاعت مفید سمجھی۔ ایڈیٹنگ کرتے ہوئے ہم نے مضمون سے جماعتی حوالے سے صَرفِ نظر کیا ہے اور ذیلی عناوین قائم کر دیے ہیں تاکہ قارئین کو مضمون پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔ مدیر]

دنیا میں جتنے علوم وفنون ہیں وہ سب درحقیقت دو حصوں پر مشتمل ہوتے ہیں: ایک حصہ تو خالص اُن معلومات پر مشتمل ہوتا ہے جو انسان کو دنیا اور اُس کی زندگی اور خود اُس کی اپنی زندگی کے متعلق مختلف زمانوں میں حاصل ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ اس چیز کا ہوتا ہے کہ حاصل شدہ معلومات کو ہر گروہ اور ہر قوم اپنے ذہن، اپنے طرزِ فکر اور اپنے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب کرتی ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ روئے زمین پر جو غذا کا سامان پھیلا ہوا ہے تو قریب قریب مشترک ہے بجز اُن فرقوں کے جو جغرافیائی اعتبار سے ہوتے ہیں۔ ورنہ ایک ہی قسم کے مواد انسان کی غذا کے لیے اس زمین پر موجود ہیں لیکن ہر قوم کے لوگ اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُس مواد کو اپنے اپنے مخصوص طریقوں سے پکاتے ہیں اور اپنے لیے مختلف شکلوں کی غذائیں تیار کرتے ہیں۔ ایسا ہی معاملہ علمی معلومات کا بھی ہے کہ جہاں تک حقائق اشیا کا تعلق ہے یعنی جہاں تک جو کچھ دنیا میں موجود ہے اس کے بارے میں معلومات کا تعلق ہے ان میں

کوئی فرق نہیں۔ فرق اس صورت میں واقع ہوتا ہے کہ ان معلومات کو جمع اور مرتب کرنے والا ذہن جس طرز پر سوچتا ہے اور جو نظریہ رکھتا ہے اُس کے مطابق ان کو مرتب کر کے کون سا فلسفۂ زندگی بناتا ہے۔ کیسا نظامِ فکر و عمل مرتب کرتا ہے اور اسی وجہ سے تہذیبوں کی شکلیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ تمام دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں ہیں وہ ان معلومات ہی پر مبنی ہیں جو اس کائنات کے متعلق انسانوں کو حاصل ہیں۔ لیکن ہر تہذیب نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اُن معلومات کو مرتب کیا ہے اور ان سے ایک نظامِ فکر و عمل بنایا ہے۔ اور اُسی نظامِ فکر و عمل کا نام ایک خاص تہذیب ہے۔ ہر تہذیب کے امتیازی خطوط اور امتیازی خدوخال اسی چیز کی بدولت پائے جاتے ہیں۔

مسلم عروج کا سبب تحقیق اور علوم کی اسلامی تشکیل تھا

اب اس سلسلے میں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اگر کوئی قوم ایسی ہو جو سوچنا اور تحقیق کرنا اور معلومات جمع کرنا اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا چھوڑ دے تو وہ جمود میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ جمود کا نتیجہ آخر کار انحطاط ہوتا ہے اور انحطاط کا نتیجہ آخر کار اس پر کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے۔ پھر جب کسی دوسری قوم کا غلبہ ہوتا ہے تو لامحالہ وہ محض سیاسی اور معاشی حیثیت ہی سے غالب نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑھ کر اس کا غلبہ فکری حیثیت سے ہوتا ہے یعنی اس کی تہذیب مغلوب قوم کی تہذیب پر غالب آجاتی ہے اب اس کے بعد دوسرا مرحلہ اس مغلوب قوم کا یہ شروع ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیتی ہے۔ دوسروں کا پس خوردہ کھانا شروع کر دیتی ہے۔ تحقیقات دوسرے کرتے ہیں، اُن کو جمع دوسرے لوگ کرتے ہیں، ان کو مرتب کر کے ایک فلسفۂ حیات دوسرے لوگ بناتے ہیں۔ ایک نظامِ فکر و عمل دوسرے لوگ تیار کرتے ہیں اور یہ اُن کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور اُن کی ہر چیز کو قبول کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل جتنا جتنا بڑھتا جائے گا اور جتنا جتنا تکمیل تک پہنچتا جائے گا اس مغلوب قوم کی انفرادیت ختم ہوتی چلی جائے گی یہاں تک کہ یہ فنا بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے۔ ایسی قومیں دنیا میں گزری ہیں جو اس طرح سے مٹیں کہ اب ان کی تہذیب صرف تاریخ کا سرمایہ ہے اور دنیا میں کہیں ان کا وجود نہیں۔

اسلامی تحریک جب دنیا میں اُٹھی تھی اُس وقت مسلمانوں نے دوسری قوموں پر محض

سیاسی یا فوجی غلبہ ہی حاصل نہیں کیا تھا بلکہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مسلمان بھی اُس وقت ایسے تھے جو تحقیقی کا کام کرنے میں سب سے پیش پیش تھے، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی بلکہ ان معلومات کو اپنے نقطۂ نظر، اپنے طرزِ فکر اور اپنے عقیدے کے مطابق مرتب کیا، چنانچہ ایک ایسی غالب تہذیب اس کی بدولت وجود میں آئی جس کے رنگ میں دنیا رنگتی چلی گئی۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلمانوں نے فن طب تک کو اس طرح سے مرتب کیا کہ طبی کتابوں کو آپ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عقیدہ رکھنے والی کسی قوم کی کتابیں ہیں۔ آغاز خدا کی حمد سے کریں گے، دوائیں اس طرح سے منتخب کریں گے کہ ان کے اندر حرام اجزاء شامل نہ ہوں۔ حلال چیزوں سے نسخے مرتب کریں گے، جگہ جگہ بیچ میں بیان اس طرح سے کریں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں۔ بیماریوں کی شفاء اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہے اور ان دواؤں کا کارگر ہونا اللہ تعالیٰ ہی کی بدولت ہے۔ نبض پر ہاتھ رکھیں گے تو بسم اللہ کہہ کر رکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کریں گے کہ وہ رہنمائی فرمائے۔ یہ ساری چیزیں ہیں، فی الحقیقت فن تھا اور وہی معلومات تھیں جو دنیا کا کوئی طبیب فراہم کرے گا لیکن ان سب کو اپنی ذہنیت کے مطابق، اپنے عقیدے اور اپنی طرزِ فکر کے مطابق انہوں نے ڈھالا۔

میں نے طب کی مثال اس لیے دی کہ طب کے متعلق آدمی یہ سمجھے گا کہ اس کا کسی عقیدے سے کیا تعلق ہے؟ لیکن آپ دیکھیے کہ جب کوئی عقیدہ اور مسلک رکھنے والا گروہ ہوتا ہے تو وہ دنیا کی ہر چیز کو اپنے نقطۂ نظر کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور وہی چیز پھر غالب ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں کے اس کام کا اثر یہ ہوا ہے کہ صدیوں دنیا یہ سمجھتی رہی کہ اگر تہذیب ہے تو مسلمانوں کی ہے۔ تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے مسلمانوں کے خلاف تعصب رکھتے تھے، دشمنی رکھتے تھے مگر تقلید اُنہی کی کرتے تھے۔ دنیا میں مسلمانوں نے شرک کی جڑ کاٹ دی تھی اور توحید کو اس قوت کے ساتھ پھیلایا اور توحید کی اساس پر ایک نظامِ فکر اس قوت کے ساتھ مرتب کیا کہ مشرکین کے لیے یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ شرک ہی حق ہے وہ مشرکین جو کبھی کہا کرتے تھے کہ ﴿VZYnZZ ZUZ ov Z vUZZ ZZZ θ#LKUH LøXCAUj VUDLB&u6F" i﴾ [ص ۳۸: ۵] یہ کیسی عجیب بات ہے کہ سارے خداؤں کو ختم کر کے اس شخص نے ایک ہی خدا بنا دیا۔ کہاں تو وہ

وقت تھا جب وہ سمجھتے تھے کہ شرک حق ہے اور توحید عجیب بات ہے اور پھر کہاں یہ صورت حال ہوگئی کہ زیادہ مدت نہ گزری کہ مشرکین کے لیے یہ کہنا مشکل ہوگیا کہ کئی خدا ہیں۔ انہوں نے اپنے عقیدوں کی تاویل اس طرح سے کرنی شروع کردی کہ ہم مانتے تو ایک ہی خدا کو ہیں لیکن یہ دوسری چیزیں جو ہم کررہے ہیں یہ اُسی خدا تک تقرب وشفاعت کا ذریعہ ووسیلہ ہیں۔ مختلف مشرک قوموں کے اندر توحیدی مسلک اور مذاہب پیدا ہوگئے۔ خود آپ کے اس ملک میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اسی طرح سے مسلمانوں کا مرتب کردہ فلسفہ، اُن کی مرتب کردہ سائنس، اُن کے مرتب کردہ علوم عمرانی یہ ساری چیزیں دنیا کے اوپر چھاتی چلی گئیں۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کی جو تحریک اُٹھی تھی وہ مسلمانوں ہی کے سکھائے ہوئے علوم کی بدولت اُٹھی تھی جو کچھ اسپین میں مسلمانوں کے علوم وفنون تھے اور جو ان کی درس گاہیں تھیں ان سے استفادہ کرکے جو لوگ تیار ہوئے تھے وہی لوگ مغرب میں اس تحریک کے موجب بنے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ یورپ کے اہل علم عربی زبان میں لکھنا اور بولنا قابل فخر سمجھتے تھے۔ بہت سے لوگ ایسے تھے جو اُن کے مذہبی پیشواؤں میں شمار ہوتے تھے لیکن وہ اپنے پرائیویٹ خطوط عربی زبان میں لکھتے تھے۔ اُس زمانے کے لوگوں کی شکایت آج تک تحریری شکل میں موجود ہے کہ ہماری قوم کے اہل علم وفکر پر عربی زبان اس طرح مسلط ہوگئی ہے کہ وہ اپنی پرائیویٹ زندگی تک میں عربی زبان کو استعمال کرتے ہیں اور اپنی قومی زبان کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ یہ سب کچھ اس بات کا نتیجہ تھا کہ اس وقت علمی تحقیقات کا کام مسلمان کرتے تھے اور دوسری قومیں اُن کا پس خوردہ کھاتی تھیں۔ ان کے مرتب کردہ علوم کو سیکھتی تھیں۔ جس طرز پر مسلمانوں نے ان کو مرتب کیا تھا اُس طرز پر وہ اُن کو پڑھتی تھیں اور حاصل کرتی تھیں اور نتیجہ یہ تھا کہ ان کی ذہنیتیں اسلام کے طریقہ پر ڈھلتی تھیں۔ مغربی ممالک میں جو مسیحی متکلمین کا ایک گروہ گزرا ہے اُس کی کتابیں آپ پڑھیے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے متکلمین کی اور اُن کے علم کلام کی جوں کی توں نقل اُتاری جارہی ہے۔ وہی مسائل ہیں، وہی اصطلاحات ہیں، وہی بحثیں ہیں بجز اس کے کہ انہوں نے مسیحی عقیدے کو اس کے اندر شامل کردیا ہے۔ لیکن آپ مسیحی متکلمین کی تحریروں میں اور مسلمان متکلمین کی تحریروں میں بجز تثلیث اور ابنیت کے عقیدے کے اور کوئی فرق نہیں پائیں گے۔

مسلم زوال کا سبب۔ ترک تحقیق

اس کے بعد ایک دوسرا دور آیا جس میں مسلمانوں نے نئی تحقیقات کا کام قریب قریب

ترک کر دیا۔ جو کچھ اوائل کے علوم تھے انہی کو پڑھتے پڑھاتے رہے، انہی کے اُوپر حاشیے چڑھاتے رہے، حاشیے در حاشیے لکھتے چلے گئے۔ لیکن نئی تحقیقات اور علوم وفنون میں آگے بڑھنے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور دوسری طرف اسی زمانہ میں اہل مغرب نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا اور علمی تحقیقات شروع کیں۔ انہوں نے نئی نئی معلومات جمع کرنی شروع کیں۔ انہوں نے اُن کو مرتب کر کے نئے فلسفے اور نئے نظام ہائے فکر وعمل کی تشکیل شروع کر دی اس کا جو نتیجہ نکلا وہ یہ کہ ایک طرف مسلمان رفتہ رفتہ جمود میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور دوسری طرف اس علمی تحریک کی بدولت مغرب کی طاقت روز بروز بڑھنی شروع ہوگئی۔ ظاہر ہے جب وہ نئی نئی معلومات جمع کریں گے اور نئی نئی تحقیقات کریں گے تو نئے نئے ذرائع اور وسائل ان کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اُن کے ذہنوں میں زندگی اور بیداری پیدا ہوگی اور آپ اس کو چھوڑ دیں گے تو آپ کے اندر لامحالہ جمود اور تعطل پیدا ہوگا۔ آپ اپنی تاریخ کو اُٹھا کر دیکھیے اٹھارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے مسلمانوں اور اہل مغرب کے درمیان اتنا نمایاں فرق ہوگیا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہوگئے اور مغربی قومیں اُن پر غالب آنی شروع ہوگئیں۔ دو تین سو برس جمود یں لگے اور اس جمود کا نتیجہ آخر کار یہ ہوا کہ مسلمان مغلوب ہونا شروع ہوگئے اور مغربی قومیں غالب آنے لگیں۔ اٹھارہویں صدی سے مسلمانوں پر مغربی قوموں کی یورشیں اور ان کی فتوحات خود اس باپ پر شاہد ہیں کہ علمی تحقیقات چھوڑ دینے اور جمود اختیار کرنے کے نتائج ہم نے کیا بھگتے اور انہوں نے اس کام کا بیڑا اٹھانے کے کیا فوائد حاصل کیے؟

جیسا کہ میں نے آپ سے عرض کیا کہ جمود کا لازمی نتیجہ انحطاط ہے اور انحطاط کا لازمی نتیجہ مغلوبیت ہوتا ہے۔ لیکن اگر علمی تحقیقات کی جائیں اور مسلسل کی جائیں اور نئی نئی معلومات فراہم کی جائیں اور اُن کی بنیاد پر نئے نئے فلسفہ زندگی تیار کیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حرکت پیدا ہوتی ہے۔ طاقت پیدا ہوتی ہے اور اُس قوم کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ غلبہ حاصل ہونے کے بعد جمود پر ہی معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو قوم غالب ہے اور جو تحقیقات کر رہی ہے، علوم وفنون کو جمع کر رہی ہے، معلومات فراہم کر رہی ہے اور اُن کو مرتب کر کے ایک تہذیب بنا رہی ہے وہ لازماً اپنی تہذیب کے ساتھ غالب آتی ہے۔ محض اپنی سیاست اپنے اسلحہ اور اپنی فوج ہی سے غلبہ نہیں پاتی بلکہ اس کی پوری تہذیب مغلوب قوم پر

غالب آنی شروع ہوجاتی ہے۔ یہ نقشہ پہلے بھی ہم دیکھ چکے ہیں اور آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

اسلام کے غلبہ کے دور میں تمام دنیا یہ محسوس کرتی تھی کہ تہذیب ہے تو مسلمانوں کی ہے۔ تمدن ہے تو مسلمانوں کا ہے اور فکر و علم ہے تو مسلمانوں کا ہے۔ اب اُس کے برعکس یہ صورتِ حال پیدا ہوئی کہ خود مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات اُتر گئی کہ کوئی تہذیب ہے تو اہل مغرب کی ہے، کوئی تمدن ہے تو اہل مغرب کا ہے۔ غرض علم وفن جو کچھ بھی ہے اہل مغرب کا ہے، ہمارا کام اُن کا پس خوردہ کھانا ہے۔ ہمارا کام ان کے پیچھے چلنا ہے۔ ہمارا کام ان کی تقلید کرنا ہے۔ یہ عملاً صورت پیدا ہوچکی ہے، چاہے زبان سے انکار کریں، چاہے زبان سے ہم مزاحمت کرنے کی کوشش کریں اور زبان سے ہم اظہار برائت کریں لیکن دیکھیے عملاً کیا ہو رہا ہے؟ عملاً یہی ہو رہا ہے کہ ہمارے اوپر مغرب کے افکار اور فلسفے، اُن کے طرزِ زندگی، اُن کی تہذیب اور تمدن سب کچھ چھاتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے میں جو بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اگر ہم اپنی زندگی چاہتے ہیں، اپنی بقا چاہتے ہیں اور اپنا ارتقا چاہتے ہیں، تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم نئے سرے سے علمی تحقیقات کا کام کریں۔

علمی تحقیقات کی نوعیت

اس سلسلے میں یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ علمی تحقیقات کس نوعیت کی ہمیں مطلوب ہیں؟ ایک تو وہ ریسرچ ہے جو مغربی محققین ہم کو سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک بے مقصد، بے رنگ اور محض ریسرچ برائے ریسرچ ہے مثلاً کتابوں کو ایڈٹ کرنا، اُن کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے اُن کی عبارتوں کے فرق کو پرکھنا، اور مصنفین کے سنین وفات و پیدائش کو جمع کرنا اور اسی قبیل کی جو ریسرچ ہے یہ بے مقصد اور بے معنی ریسرچ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ علوم وفنون میں مددگار ہوتی ہے لیکن بجائے خود یہ وہ ریسرچ نہیں ہے جو کسی قوم کو زندگی کی حرارت عطا کرتی اور حیات کی حرکت پیدا کرتی ہے۔ یہ ٹھنڈی اور بے معنی ریسرچ ہے۔ اہل مغرب ایک ریسرچ اور کرتے ہیں وہ محرک قسم کی ریسرچ ہے، وہ اس مقصد کے لیے ہے کہ اُن کے پاس وہ طاقتیں فراہم ہوں جو ان کو دنیا پر غالب کرسکیں۔

ایک اور قسم کی ریسرچ جو اب ہمارے ملک میں شروع ہورہی ہے وہ یہ ہے کہ ریسرچ تو

اسلام کی کی جائے ،مگر اس غرض کے لیے کہ ایک نیا اسلام تصنیف کیا جائے، جو تمام مغربی افکار واقدار کے بالکل مطابق ہو۔یعنی جو کچھ مغرب میں حلال ہے وہ حلال ثابت کیا جائے جو کچھ مغرب کی نگاہ میں حرام ہے اُسے حرام ثابت کیا جائے اور اسلام کو کسی نہ کسی طرح ڈھال کر ایسا دکھایا جائے کہ گویا یہ بھی مغربی تہذیب وتمدن کا ایک دوسرا ایڈیشن ہے یہ ریسرچ بھی ہمارے کسی کام کی نہیں ہے۔

ہم جو ریسرچ چاہتے ہیں اور جس غرض کے لیے چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک اسلام کے مطابق علوم وفنون کی تحقیقات کی جائے اور تحقیقات کر کے اسلام کے نظام فکر وعمل کو باقاعدگی کے ساتھ مرتب کیا جائے۔اس سلسلے میں چند مقاصد ہمارے پیش نظر ہیں اور اُنہی مقاصد کی تحصیل کے لیے ہم کام کرنا چاہتے ہیں۔

مقاصدِ تحقیق

۱۔ سب سے پہلا کام ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ مغربی فکر اور مغربی فلسفۂ حیات کا جو طلسم بندھا ہوا ہے اس کو توڑ ڈالا جائے۔ایک معقول اور مدلل علمی تنقید کے ذریعے یہ بات ثابت کی جائے کہ مغربی علوم وفنون میں جتنے حقائق اور واقعات ہیں وہ دراصل تمام دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہے اور اس کے ساتھ کسی تعصب کا کوئی سوال نہیں ہے لیکن ان معلومات وحقائق کو جمع کر کے جو فلسفۂ حیات اہل مغرب نے بنایا ہے وہ قطعی باطل ہے ان کو مرتب کر کے جو طرزِ فکر اور کائنات کے متعلق جو تصور اور انسان کے بارے میں جو تصور انہوں نے قائم کیا ہے اور جس کے اوپر اپنی پوری تہذیب کی عمارت انہوں نے اٹھائی ہے، وہ ساری کی ساری از اوّل تا آخر باطل ہے جو معاشرتی علوم (Social Sciences) انہوں نے مرتب کیے ہیں، جو معاشرتی فلسفہ (Social Philosophy) انہوں نے گھڑا ہے وہ موجب فتنہ وفساد ہے، وہ انسان کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ انسان کی تباہی کے لیے ہے اور خود اُن کی اپنی تباہی کے لیے ہے۔یہ پہلا ضروری کام ہے جس کے ذریعے سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمانوں پر مغربی فکر وفلسفے کا جو سحر ہے وہ ختم ہو جائے گا جس کے بغیر مسلمانوں کو اس ذہنی مرعوبیت اور ذہنی شکست خوردگی کی حالت سے نہیں نکالا جا سکتا اور جب تک وہ اس ذہنی شکست خوردگی میں مبتلا ہیں اُس وقت تک آپ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ مقلد کی زندگی چھوڑ کر مجتہد کی زندگی اختیار کریں گے۔اس

وقت تک تو ان کا کام آنکھیں بند کرکے اہل مغرب کے پیچھے چلنا ہے۔ اس حالت کو آپ نہیں بدل سکتے جب تک کہ اس سحر کو نہ توڑ دیں اور اس حقیقت کو واضح نہ کردیں کہ علمی حقائق اور چیز ہیں اور علمی حقائق کو ترتیب دے کر ایک فلسفۂ زندگی اور نظام حیات مرتب کرنا بالکل دوسری چیز ہے۔ حقائق اپنی جگہ بالکل صحیح لیکن فی الحقیقت ان کو مرتب کرکے جو فلسفۂ حیات بنایا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔

۲۔ اس کے بعد جو دوسرا کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے تمام علوم وفنون کو نئے اسلوب اور نئے طریقے پر مرتب کیا جائے تاکہ وہ ایک اسلامی تہذیب کی بنیاد بن سکیں۔ اسی طرح اسلام کے مطابق ہمیں ایک فلسفہ درکار ہے، جو انسان کے ذہن کی اس تلاش کو تسکین دے کہ حقیقت کیا ہے؟ مگر یہ تسکین اُس عقیدے کے مطابق دے جو اسلام نے ہمیں دیا ہے، حقیقت کی تلاش اور اس کی تڑپ انسان کی فطرت میں ہے، وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا مگر تلاش حقیقت کے مختلف راستوں میں سے صحیح راستہ ہمارے نزدیک وہ ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کا تھا۔ اُس راستے کے مطابق تلاشِ حقیقت اور کائنات کی حقیقت اور حیاتِ انسان کی حقیقت نیز اُس کے مآل کو ایک فلسفے کی شکل میں مرتب کرنا تاکہ آدمی کو اُس کے مطابق ڈھالا جائے اور ظاہر ہے یہ اس کے بغیر نہیں ہوسکتا کہ ہم ایک فلسفہ اسلام کے نقطۂ نظر کے مطابق مرتب نہ کریں۔ اس کے بغیر یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ آپ کی یونیورسٹیوں میں اور آپ کے کالجوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے یا نفسیات کے جو علوم پڑھائے جاتے ہیں یا دوسرے فلسفیانہ علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کو تبدیل کیا جاسکے اور ان کی جگہ کوئی دوسرا فلسفہ پڑھایا جاسکے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ روس میں مغربی تہذیب سے بالکل مختلف ایک تہذیب اٹھانے کی کوشش کی گئی اور جب روسیوں نے کمیونسٹ طرزِ فکر کو اختیار کیا تو وہ کسی طرح سے بھی اس بات کو گوارا نہیں کرسکے کہ جس کو وہ بورژوا فلسفہ کہتے ہیں وہ اسے اپنی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھائیں کیونکہ بحیثیت کمیونسٹ ان کے اپنے وجود کے لیے یہ ضروری اور ناگزیر تھا کہ وہ ایک کمیونسٹ فلسفہ مرتب کریں اور اُسے اپنی نئی نسلوں کو پڑھائیں کیونکہ جب تک وہ اُس بورژوا فلسفے کو نہ ہٹاتے اور اُس کی جگہ اپنا اشتراکی فلسفہ ذہنوں میں نہ بٹھاتے اُس وقت تک نہ تو طرزِ فکر بدل سکتا تھا اور نہ ایک کمیونسٹ نظام کھڑا ہوسکتا تھا۔ اسی طرح ہمارے لیے بھی یہ ضروری

ہے کہ ہم ایک اسلامی فلسفہ مرتب کریں اور تمام علوم عمرانی کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔ بلا شبہ واقعات اور حقائق وہی رہیں گے جو دنیا کا مشترک علمی سرمایہ ہیں لیکن اُن واقعات اور حقائق پر ایک پورا نظامِ فکر و عمل مرتب کرنا خواہ وہ معیشت کا علم ہو، خواہ قانون اور فلسفۂ قانون کا علم ہو۔ غرض جتنے بھی عمرانی علوم ہیں ان میں سے ہر ایک کو باقاعدہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک ان کو اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب نہ کیا جائے گا اور کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ نئے علوم نہ پڑھائے جائیں گے اُس وقت تک آپ یہ توقع نہ رکھیں کہ یہاں کبھی اسلامی تہذیب اُٹھ سکتی ہے بلکہ اُس کا باقی رہنا بھی مشکل ہے۔

کیونکہ آپ اپنے گھر میں اپنے بچے کو چاہے یہ عقیدہ سکھا دیں کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے نبی تھے۔ اور چاہے آپ اس کے ذہن میں یہ بٹھا دیں گے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے۔ اگرچہ بہت سے لوگوں نے یہ کام بھی چھوڑ دیا ہے اور اپنے بچوں کو وہ مشنریوں کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ جو عقیدہ چاہیں اُن کے ذہنوں میں اُتار دیں۔ البتہ بعض لوگ احتیاطاً یہ ساری باتیں اپنے بچوں کے ذہن میں اُتار بھی دیتے ہیں لیکن وہ بچے جب کالجوں میں جاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے یہ صورت آتی ہے کہ تمام علوم جو وہ پڑھ رہے ہیں اُن کے اندر ''خدا'' کہیں بیچ میں آتا ہی نہیں۔ وہ سائنس پڑھ رہے ہوں یا عمرانی علوم کبھی ان کو یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کائنات کے اندر خدا کا بھی کوئی کام ہے، وہ بھی کچھ کر رہا ہے۔ ان کے سامنے یہ آتا ہی نہیں کہ رسولوں نے بھی کوئی علم الاقتصاد دیا ہے رسولوں نے بھی کوئی فلسفۂ قانون دیا ہے بلکہ اس کے برعکس جو علم وہ پڑھتے ہیں وہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ اسلام نے معاذ اللہ بہت سارے غلط کام کر ڈالے ہیں مثلاً اُس نے سود کو حرام کیا گویا نعوذ باللہ ایک بڑا فضول کام کیا کہ اس سے دنیا کا کوئی معاشی نظام نہیں چل سکتا اور کوئی (Financial System) کھڑا نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے سامنے یہ بات آتی ہے کہ اسلام نے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا قرار دیا گویا معاذ اللہ بڑا وحشیانہ کام کیا۔ پھر اُس نے زنا جیسی پرلطف اور تفریحی چیز پر خواہ مخواہ اتنی سخت سزا تجویز کی کہ کوڑے مار مار کر کسی کی پیٹھ کی کھال اُڑا دی جائے یہ بھی جیسے بہت وحشیانہ کام کیا۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر ذاکر حسین ①

ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم

(یہ وہ خطبۂ صدارت ہے جو ۲۴ فروری ۱۹۴۶ء کو نیو ایجوکیشن فیلوشپ، پنجاب کے اجلاس منعقدہ سنٹرل ٹریننگ کالج، لاہور میں پڑھا گیا)

بھائیو اور بہنو! سب سے پہلے، آپ کا شکریہ ادا کرنے سے بھی پہلے، میں آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ عام دستور کے خلاف آپ کی خدمت میں یہ خطبہ اپنی مادری زبان میں پیش کر رہا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر کسی دوسری زبان میں آپ کو مخاطب کرتا تو عذر خواہ ہوتا لیکن ہماری مجلسوں کے عام دستور نے صورتِ حال کو بالکل الٹا کر دیا ہے۔ انگریزی، ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان بن گئی ہے۔ وہ اس میں پڑھتے ہیں، اس میں لکھتے ہیں اور اگر کبھی سوچتے ہوں تو شاید اسی میں سوچتے ہیں۔ جب اہل علم کی کسی مجلس میں کچھ کہنا ہوتا ہے تو اپنے افکار کو انگریزی الفاظ ہی کا جامہ پہنا کر پیش کرتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟ اس سے مجھے اس وقت بحث نہیں۔ اچھا ہوا یا بُرا ہوا، اس پر بھی کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اگر ہمارے ملک میں تعلیم کسی ایک چھوٹی سی ذات کے ساتھ مخصوص رہنے والی نہیں ہے، اگر اس ملک کے بسنے والے جانورں کے گلوں کی طرح نہیں بلکہ آدمیوں کی جمعیتوں کی طرح زندگی گزارنے پر مصر ہیں، اگر تعلیم یہاں کے جمہور کی مرضی کے مطابق ہونے والی ہے تو علمی زبان کے معاملے میں صورتِ حال بدلے گی اور جلد بدلے گی۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں انگریزی زبان کی قدر کرنا نہیں جانتا۔ میں جانتا ہوں کہ ہم نے انگریزی زبان کی معرفت بہت کچھ سیکھا ہے، جانتا ہوں کہ بہت کچھ اس سے اور سیکھنا ہے۔ اس نے ہماری حیات کے جمود میں حرکت پیدا کی۔ اس نے ہمیں مغرب کے علوم وفنون، صنعت وحرفت، تمدن وافکار سے آشنا کیا۔ اس نے سیاست اور معیشت کے نئے اسلوبوں سے ہمیں آگاہ کیا۔ اس کا ہم پر بڑا احسان ہے اور اس سے ابھی اور بہت کام لینا ہے کہ ہم میں اور مغربی تمدن میں یہی ایک واسطہ شاید عرصے تک قائم رہنے والا ہے۔ لیکن جہاں میں یہ سب

① ماہر تعلیم، بانی وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی وسابق صدر بھارت

جانتا ہوں وہاں یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم انگریزی جاننے والوں نے جو ایک نئی ذات اس ملک میں بنالی ہے، اس نے غیر شعوری خودغرضی سے ہر ذات کی طرح اپنے مخصوص فوائد کو اپنے تک محدود رکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ اس نے اپنے علم کو تفوق کا ذریعہ بنایا ہے۔ جو سیکھا وہ سکھایا نہیں۔ خواص کو جو حاصل ہوا عوام تک نہیں پہنچایا گیا۔ اپنے کو سیراب کیا ہے اور قوم کو پیاسا رکھا ہے اور چونکہ علم و حکمت کے خزانے بچانے سے گھٹتے ہیں اور لٹانے سے بڑھتے ہیں اس لیے اس طبقے کی خودغرضی نے اسے بھی کچھ کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اپنی قوم کی حقیقی زندگی سے بے تعلقی نے انہیں اپنے دیس میں پردیسی بنادیا، وطن میں جلاوطن کردیا، ان کے افکار میں جودت پیدا نہیں ہونے دی، ان کے کردار کو خلوص سے بہرہ یاب نہیں ہونے دیا، ان کی زبان کو مانگے کی گفتگوئیں ملیں اور ان کے دلوں کو مانگے کی آرزوئیں۔ اقبال نے سچ کہا ہے ؎

بر زبانش گفتگو ہا مستعار

در دلِ او آرزو ہا مستعار

خیر یہ جو ہوا سو ہوا۔ ہمیں اب جلد سے جلد اسے بدلنا چاہیے۔ خصوصاً تعلیم کا کام کرنے والوں کو اس میں ذرا دیر نہ کرنی چاہیے کہ اپنی راہ سے ایک پردیسی زبان کے ذریعے تعلیم دینے کی مصیبت کو ہٹائیں اور ابتدائی اور اس سے پہلے کی تعلیم کے مسائل پر سوچ بچار کرنے کے لیے جو کانفرنس یہاں جمع ہے اس کے اراکین کو تو جاننا چاہیے کہ ان کا سارا کام بچوں میں اور بچوں کے والدین کے ساتھ مادری زبان ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس لیے اپنی زبان میں خطبہ دینے پر معافی مانگنا کچھ بہت ضروری تو نہیں ہے لیکن رسم ورواج کے مطالبے سخت ہوتے ہیں۔ ہماری علمی مجلسوں میں مادری زبان کو راہ ملنا نئی بات ہے۔ میں آپ سے اجازت لیے بغیر اسے یہاں لے آیا ہوں۔ اس لیے معافی چاہتا ہوں، اگرچہ اس عذرخواہی میں تھوڑا سا گلہ اور تھوڑی سی تنبیہ ضرور شامل ہے۔

آپ نے معاف کردیا ہو، اور یقین کرتا ہوں کہ معاف کرہی دیں گے تو اب آگے چلوں۔ سب سے پہلے آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اس مجلس کی صدارت کے لیے آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ میں نیوایجوکیشن فیلوشپ کے کام سے ایک عرصے سے واقف ہوں اور اس کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اس فیلوشپ نے دنیا کے مختلف ممالک میں تعلیم کا کام کرنے والوں کو نئی راہیں سجھائی ہیں۔ اس سے بچوں کی انفرادیت کو سانچوں اور ٹھپوں میں دبانے سے

بچانے کی کوشش کی ہے۔ بچوں کی صلاحیتوں اور میلانوں کو ان کی تعلیم کی بنیاد بنانے پر زور دیا ہے۔ بچوں کے ذاتی شوق کے کاموں کی مدرسے اور گھر میں ہمت افزائی کی ہے۔ آزادی میں ڈسپلن کے صحیح تصور کو عام کیا ہے۔ تعلیم میں کھیل اور اجتماعی کام کی اہمیت کو جتایا ہے اور سب سے اہم یہ کہ تعلیم کا کام کرنے والے استادوں کو ایک نئی اُمید بخشی ہے اور ان میں ایک نیا ولولہ پیدا کیا ہے، اور ایک بے روح سے انفرادی بیگار کو ایک پُرکیف جماعتی وظیفے کا مرتبہ دلایا ہے۔ اس فیلوشپ کی کسی کانفرنس میں صدارت کا شرف میرے استحقاق سے بہت زیادہ ہے لیکن آپ کی محبت نے مجھے یہ شرف بخش دیا، دل سے شکرگزار ہوں۔

آپ اس مجلس میں ابتدائی تعلیم اور اس سے پہلے کی تعلیم دونوں کے متعلق غور و بحث کرنے والے ہیں مَیں نے ابتدائی تعلیم کے مسائل پر سوچنے اور کام کرنے میں کچھ وقت ضرور صَرف کیا ہے لیکن اس سے پہلے کی تعلیم کے متعلق اب تک کچھ نہیں کر سکا ہوں۔ اس لیے ذاتی تجربے سے اس پر کچھ عرض نہیں کر سکوں گا۔ البتہ لازمی بنیادی تعلیم کی حمایت کی وجہ سے بعض احباب نے مجھ پر جو یہ شبہ کیا ہے کہ میں اس سے پہلے کی تعلیم و تربیت کو شاید کچھ اہمیت نہیں دیتا اور اس کے مسائل کو قابل توجہ نہیں سمجھتا وہ درست نہیں ہے۔ انفرادی عملی زندگی میں 'ایک وقت میں ایک چیز' کا اصول اکثر کارآمد ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے معنی دوسری سب چیزوں سے غفلت یا بے تعلقی نہیں ہوتے۔ بنیادی تعلیم کی ضرورت پر اسے مفت اور لازمی بنانے پر پچھلے چند سال میں بجا طور پر زور دیا جاتا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس بنیادی تعلیم کی منزل سے پہلے کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اب تک ابتدائی عمر میں تربیت کے مسئلے کو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا ہے حالانکہ زندگی کی بعض بنیادی عادتوں کے بننے بگڑنے میں یہ عرصہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ جسمانی نشو و نما کو دیکھیے کہ عمر کے پہلے ہی سال میں بچے کا قد پیدائش کے وقت سے کوئی تگنا ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر کبھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھتا۔ پہلے ۱۸ مہینے میں دماغ کے وزن میں جتنا اضافہ ہوتا ہے پھر کبھی اتنی مدت میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا۔ نظامِ اعصابی اور حسی اعضا کا بھی یہی حال ہے۔ بدن کی اس تیز رفتار بڑھوتری کی وجہ سے ہی یہ زمانہ تندرستی کے لیے خطروں سے پُر زمانہ ہے۔ ہمارے ملک کا تو کہنا ہی کیا یہاں کی فضا میں جو ہزار بچے پہلا سانس

لیتے ہیں ان میں سے پونے دوسو کے قریب توطفلی کی منزل سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔ دوسرے ممالک میں بھی جہاں زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے اور بچے زندگی کے دسترخوان پر ناخواندہ مہمان کی حیثیت نہیں رکھتے، وہاں بھی یہ خطرے ننھی ننھی جانوں کو انگیز کرنے پڑتے ہیں۔ امریکا میں بھی ساری اموات کا ایک تہائی ۶ سال سے کم عمر والوں کے حصہ میں آتا ہے۔ انگلستان میں اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۸۰ سے ۹۰ فیصد بچے تندرست پیدا ہوتے ہیں، مگر جب ۵ سال کی عمر میں مدرسے جاتے ہیں اور وہاں طبی معائنہ ہوتا ہے تو ایک تہائی سے زیادہ طرح طرح کے امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں، کہیں غذا کی وجہ سے، چاہے کمی سے چاہے زیادتی سے، کہیں متعدی امراض کے نتیجے کے طور پر، کہیں گھر کے مضرِصحت طبیعی ماحول کی بدولت، کہیں گھر کی نفسیاتی الجھنوں کی کھینچ تان کے اثر سے، اور جہاں ان حالات کو بدلا گیا ہے وہاں یہ صورت بھی بدل جاتی ہے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ اچھی تربیت گاہوں میں جاکر بچوں کی صحتیں درست ہوجاتی ہیں، بیماریاں بھاگ جاتی ہیں، دانتوں کی حالت اور ہوجاتی ہے اور بچوں کا قد اوروزن تیزی سے بڑھتا ہے۔ پھر یہی نہیں کہ یہ زمانہ بچے کی جسمانی نشوونما ہی کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہو، سیکھنے کی رفتار بھی جسمانی بڑھوتری کی رفتار سے کچھ کم نہیں ہوتی۔ اسی زمانے میں بچہ حواس کا استعمال سیکھتا ہے۔ ان کی مدد سے اپنے ماحول کی پہچان حاصل کرتا ہے، جسم کے پٹھوں پر قابو حاصل کرتا ہے، حسی اور حرکتی تجربے میں تطابق پیدا کرتا ہے، چلنا سیکھتا ہے، بولنا سیکھتا ہے۔ ڈھائی تین سال کی عمر میں اپنی مادری زبان کو کام چلانے کے لائق سیکھ چکا ہوتا ہے۔ چیزوں کے روابط باہمی کا درک اسے ہونے لگتا ہے۔ تفصیل کی راہ پر اسی عمر میں گامزن ہونا شروع کرتا ہے اور تجربے کے جذباتی پہلو سے تو اس کے نشوونما کی تیز رفتاری کا یہ حال ہے کہ جاننے والے کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں اس کی سیرت کی بنیادیں پڑتی ہیں۔ زندگی کا اور کون سا زمانہ اتنی اور ایسی بنیادی اہمیت رکھنے والی تفصیلات سے پُر ہوگا؟

نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہماری قومی زندگی کی تشکیل اور تنظیم کے ذمے دار واقعی اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونا چاہتے ہیں تو انہیں اس عمر کے بچوں کی تربیت کو پہلے سے زیادہ اپنے منصوبوں میں جگہ دینی ہوگی۔ مَیں نہیں جانتا کہ بنیادی تعلیم ۶ سال کی عمر سے لازمی کی جائے گی جیسا کہ سنٹرل ایڈوائزری بورڈ کی تجویز ہے یا ۷ سال کی عمر سے جیسا کہ بنیادی

قومی تعلیم کی تجویز کا مطالبہ ہے۔ بہر حال ٦ سے (یا جو عمر آپ کی کانفرنس غور و بحث کے بعد طے کرے) ٦ یا ٧ سال کی عمر کے بچوں کی دیکھ بھال، طبی جانچ اور مناسب علاج، ان کے لیے کھلی ہوا میں اپنے ہم عمروں کے ساتھ دن کا ایک معتدبہ حصہ گزارنے کا انتظام، اس عمر کی ضرورتوں اور تقاضوں کو جاننے والوں کی مشفقانہ نگرانی میں صحت اور صفائی کی، میل جول کی زندگی کی، اپنے ننھے ننھے پیروں پر کھڑے ہوسکنے کی، دوسرے ننھے اور نازک ساتھیوں کو سہارا دینے کی، انفرادی اور اجتماعی عادتیں پیدا کرنے کا اہتمام ضرور کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں اس عمر کے بچوں کو بالک باڑیوں اور ننھوں کی تربیت گاہوں میں بھیجنا ابھی والدین پر لازم تو نہیں کرنا چاہیے، لیکن بچوں کی ایک بڑی تعداد کے لیے، خصوصاً جہاں گھر معاشی یا دوسری مجبوریوں کی وجہ سے اپنا فرض انجام نہیں دے سکتا، ان تربیت گاہوں کا انتظام حکومت کی طرف سے ضرور ہونا چاہیے۔ غیر سرکاری انتظام میں ایسی تربیت گاہیں کھولی جائیں تو فیاضی سے ان کی مدد حکومت کا فرض ہے۔ اتنی چھوٹی عمر کے بچوں کو گھر سے علیحدہ کرنا بہت نئی سی بات ہے اور بہت سے گھر شاید اپنا فرض آپ انجام دینے کے قابل بھی ہوں۔ اس لیے فی الحال اگر اس عمر کے بچوں میں دس میں سے دو ان تربیت گاہوں میں لے آئے جائیں تو حساب کے اعتبار سے تو کم ہی ہیں مگر عملی لحاظ سے کافی ہوگا۔ ان کے لیے علیحدہ تربیت گاہیں کھول کر یا بنیادی مدرسوں کے ساتھ ان چھوٹے بچوں کے لیے علیحدہ خاص انتظام کر کے حکومت اپنے فرض سے سبک دوش ہوسکتی ہے، بشرطیکہ مدرسے کے اس حصے کی دیکھ بھال کے لیے الگ تربیت یافتہ استاد بلکہ استانیاں فراہم کی جائیں اور بچوں کی صاف کھلی ہوا میں ایک اچھے باغیچے کے اندر گھر سے بہتر ماحول میں رکھنے کا انتظام ہوسکے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تربیت گاہیں یا بالک باڑیاں اس لیے درکار ہیں کہ بہیترے بچوں کو اپنا گھر نصیب نہیں۔ افلاس، جہالت اور بیماری وغیرہ بچوں کو اکثر گھر کی حقیقی نعمتوں سے محروم رکھتے ہیں اس لیے بھی ان تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ اگر گھر وہ سب کچھ ہو جو اُسے ہونا چاہیے تب بھی وہ سب کچھ فراہم نہیں کرسکتا جس کا مطالبہ ننھے بچے کو نشوونما اور تیزی سے نت نئی شکلیں اختیار کرنے والی طبیعت کرتی ہے، اس لیے ان نئی تربیت گاہوں کے بناتے وقت یہ بات سامنے رکھنی چاہیے کہ یہ گھر کا بدل بھی ہیں اور گھر کی

کمیوں کو پورا کرنے والی بھی۔ بچے کی تربیت میں گھر کا بڑا اثر ہوتا ہے اور اگر ان تربیت گاہوں نے گھر سے اپنا رشتہ مضبوط نہ کیا تو یہ اپنا کام کبھی خوبی سے سرانجام نہ دے پائیں گی۔ ایک طرف ان کی واقفیت سے کام لینا ہوگا، دوسری طرف ماں کو بچے کی خدمت کی راہیں سمجھانی اور سجھانی ہوں گی۔ اس کا کچھ بوجھ اپنے کندھوں پر لینا ہوگا تا کہ جو بوجھ اس کے ذمے رہے وہ اسے زیادہ خوبی سے اٹھا سکے۔ ان تربیت گاہوں کو طبی معائنے کا انتظام کرنا ہوگا اور وہ طبی امداد پہنچانی ہوگی جس کی بچے کو ضرورت رہتی ہے۔ انہیں بچے میں اچھی اچھی عاتیں ڈالنی ہوں گی اور ایسا ماحول پیدا کرنا ہوگا جس میں وہ اپنی عمر کے تقاضوں کے اعتبار سے وہ سیکھ سکیں جو فطرت چاہتی ہے کہ وہ سیکھ جائیں۔ وہاں طرح طرح کے کھیلوں کا انتظام کرنا ہوگا، تعمیری بھی، تخیلاتی بھی، تخلیقی بھی اور بچے کو اپنی بدنی نشوونما کے لیے جس عمل اور حرکت کی ضرورت ہے اس کے مواقع بھی فراہم کرنے ہوں گے۔ آس پاس کی چیزوں کے خواص سے آگاہی کا سامنا کرنا ہوگا۔ ان کے برتنے میں جو ہنرمندی درکار ہے اس کی بنیاد ڈالنی ہوگی اور بات چیت کرنے، اپنے ساتھیوں اور اپنے بڑوں سے اپنی کہنے اور ان کی سمجھنے کا خوگر بنانا ہوگا۔

پھر ۲، ۳ سال کی عمر ہی سے بچے کو ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے، خالی ماں کی رفاقت کافی نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اِردگرد اور بچے چاہتا ہے۔ ان سے سہارا لینا، انہیں سہارا دینا چاہتا ہے اور جماعتی زندگی کا تمدن آفریں بنیادی لین دین شروع ہوجاتا ہے۔ اس لیے بچے کو دوسرے بچوں کی صحبت اور رفاقت ملنی چاہیے اور یہ چیز یہ تربیت گاہیں اکثر گھروں سے زیادہ خوبی سے فراہم کرسکتی ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ساتھیوں کا یہ طبقہ کہیں بہت بڑا نہ ہوجائے۔ جب رفیق بہت زیادہ ہوجائیں تو وہ بھائی بہن نہیں رہتے انبوہ بن جاتے ہیں جس میں بچہ کھوسا جاتا ہے اور جس سے اسے کبھی کوئی داخلی لگاؤ پیدا نہیں ہو پاتا۔ وہ اس انبوہ میں یا تو اندر کو کھنچ جاتا ہے، شرمیلا اور جھینپو بن جاتا ہے یا پھر لڑتا جھگڑتا ہے اور ہر ایک پر دھونس جمانے کی کوشش کرتا ہے، یا دب جاتا ہے یا دبانا چاہتا ہے۔ تعداد بڑھانے میں ننھے بچوں کے لیے متعدی امراض کا خطرہ بھی لاحق ہوتا ہے اس لیے تعداد کو کم ہی رکھنا ٹھیک ہے۔ اور اس کا خیال اس وجہ سے اور بھی ضروری ہے کہ ہم کہیں اپنی مالی دشواریوں کے پیشِ نظر یا کام کو جلد پھیلانے کی خاطر یہ نہ کر بیٹھیں کہ ان تربیت گاہوں میں بہت سے بچوں کو یکجا کردیں۔ میری رائے میں تو ایک تربیت گاہ میں ۳۰، ۴۰ سے زیادہ بچے نہیں ہونے چاہئیں۔ (جاری ہے)

تزکیۂ نفس

محمد ندیم اعوان[۱]

رمضان ابتداء ہے، انتہاء نہیں!

کل کی تو بات ہے کہ رمضان کی آمد آمد کا سندیسہ ہر جانب سنائی دے رہا تھا اور اتنے میں عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد امام صاحب نے رمضان کی خوشخبری دی اور تراویح پڑھائی۔ یہ ماہِ مبارک اپنی پوری آب و تاب، انوار و برکات، احسانات و انعامات اور کرامات کے ساتھ امت مسلمہ پر سایہ فگن ہوا۔ بے پایاں رحمتوں کے نزول اور لاتعداد بخششوں کے بعد اب جہنم سے نجات کی نوید دیئے جا رہا ہے۔ اعتکاف، لیلۃ القدر اور پھر شوال کا چاند تحفے میں دے کر یہ مہمان ہم سے رخصت ہو جائے گا۔ شاید جب تک آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہوں گے رمضان گزر چکا ہوگا۔

اس ماہ مبارک کے گزرنے کے بعد عموماً دو طرح کے احساسات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کچھ لوگ یقیناً گناہوں کے بوجھ سے ہلکا ہونے پر خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے انتہائی مطمئن اور مسرور دکھائی دیتے ہیں، جبکہ کچھ لوگوں پر مایوسانہ کیفیت طاری ہوتی ہے جیسے کوئی مکرم، محترم اور ذی وقار مہمان رخصت ہو جائے اور بہت دنوں بعد آنے کی آس ہو۔ درحقیقت یہ دونوں کیفیتیں پیامِ رمضان اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشاء کے منافی ہیں۔ رمضان کے رخصت ہونے سے مسلمان شریعت کے احکام سے آزاد ہو جاتے اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق بہرحال ختم ہو جاتا ہے، بلکہ رمضان انسان کے اندر ایک نئی زندگی گزارنے کا جذبہ اور تحریک پیدا کرتا ہے اسی لیے مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ فرمایا کرتے تھے کہ رمضان انتہا نہیں، ابتدا ہے۔ رمضان المبارک میں قرآن کی تلاوت، ذکر اذکار، نوافل و صدقات، نیک اعمال کی کثرت، گناہوں سے پرہیز کے باوجود ہمارا کام ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ ہماری ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں، تاہم یہاں چند اُن کاموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس کی پابندی رمضان کے بعد بھی ہمیشہ کرتے رہنا چاہیے۔

---

[۱] nts143043@gmail.com

اول یہ کہ ہمیشہ اپنے گناہوں کی معافی، درجات کی بلندی اور رزق میں برکت کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے یعنی’’ سچی توبہ‘‘ کی صفت سے اپنے آپ کو متصف رکھنا چاہیے کیونکہ انسان کو ولایت کے مقام تک پہنچانے کا یہ واحد راستہ ہے۔ دل و دماغ کی صفائی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کا زینہ ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اطمینان قلبی نصیب ہوتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی دعائیں عرش باری تعالیٰ پر قبولیت کا شرف حاصل کرتی ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنہیں نفسا نفسی کے عالم میں عرش کا سایہ نصیب ہوگا یہی وہ لوگ ہیں جنہیں بہترین انسان قرار دیا گیا ہے اور یہی جنت کی بشارتوں کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں۔

دوسرا کام ہر جگہ، ہر حالت اور ہر وقت اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہنا چاہیے۔ رمضان المبارک میں کثرت استغفار سے ایمان کی تجدید کا عمل شروع ہوتا ہے، جسے اگلے رمضان تک برقرار رکھنا چاہیے، کیونکہ جانے انجانے میں ایسے کام سرزد ہو جاتے ہیں جو ایمان کی تجدید کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر روز بہ روز ایمانی کیفیت کو طاعات سے غذا اور تقویت نہ بہم پہنچائی جائے اور نہ ایمانی حرارت کو چنگاری مہیا کی جائے تو حدیث پاک میں وارد ہے کہ ’’ایمان پرانا ہو جاتا ہے جیسے کپڑے میلے اور پرانے ہو جاتے ہیں‘‘۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو کلمہ طیبہ (لا الہ الا اللہ)، جسے حدیث میں افضل ترین ذکر قرار دیا گیا ہے، کے ذریعے سے ایمان کو تازہ رکھنے کی تلقین کی ہے۔

رمضان کو حدیث میں چونکہ غمخواری اور ہمدردی کا مہینہ کہا گیا ہے، لہٰذا **تیسرا کام** آپ یہ کریں کہ رمضان گزرنے کے بعد ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ جو اپنی غربت و لاچاری کے سبب بنیادی ضروریات سے محروم ہونے کے باوجود اپنی خودی اور عزت نفس کو کبھی کسی کے ہاتھوں نیلام ہونا گوارا نہیں کرتا اور اپنی بنیادی ضروریات کے لیے ہاتھ پھیلانے سے گریز کرتا ہے، ایسے لوگوں کو ڈھونڈا جائے اور روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ ساتھ اگر ممکن ہو تو اُن کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے بھی آراستہ کیا جائے۔ یہ ایک طرف قوم کی تعمیر و ترقی میں آپ کا حصہ تصور کیا جائے گا تو دوسری طرف آپ کے لیے صدقہ جاریہ بھی ہوگا۔ (بقیہ: ۴۲)

پروفیسر طارق بٹ

جمہوریت، پاکستان اور اسلامی نظام

پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کی خدمت میں چند گزارشات

’جمہوریت‘ کو اسلامی سمجھنے والوں کے غور و فکر کے لیے

پروفیسر ملک محمد حسین صاحب ملک کے معروف ماہر تعلیم ہیں اور اسلامی تناظر میں اصلاحِ تعلیم کے لیے اپنی طویل خدمات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ وہ البرہان کے نائب مدیر بھی ہیں اس لیے ان کی ثقاہت مسلمہ ہونی چاہیے لیکن انہوں نے البرہان کے شمارہ مئی میں ڈاکٹر انیس احمد صاحب (وائس چانسلر، رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی اسلام آباد) کے ماہنامہ ’ترجمان القرآن‘ کے اشارات پر ہم نے جو تبصرہ کیا تھا، اس پر رائے زنی کی ہے اور ہم اس پر نرم سے نرم تنقید بھی کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے بہت کمزور بات کی ہے۔ ایسی سادگی بلکہ سادہ لوحی علمی معاملات میں نہیں چلتی۔ ہمارے سامنے چار بنیادی سوال ہیں:

۱۔ ’جمہوریت‘ کیا ہے؟

۲۔ مغربی فکر و تہذیب میں ’جمہوریت‘ کا جو تصور ہے کیا وہ ’اسلامی‘ ہے؟

۳۔ کیا مغرب کی ’جمہوریت‘ کو اسلامیا کر ’اسلامی جمہوریت‘ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ اور اس کے ذریعے اسلامی نظام/غلبۂ دین/ اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے؟

۴۔ اگر پاکستان میں ’اسلامی جمہوریت‘ کے ذریعے ’اسلامی نظام‘ کا ہدف حاصل نہیں کیا جا سکا اور نہیں کیا جا سکتا تو اس کا حل کیا ہے؟

جب تک ہم ان چاروں سوالوں کا جواب نہ دیں اس موضوع کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی لہٰذا ہمیں مجبوراً کچھ تفصیل میں جانا پڑے گا، اور ابتداء کرتے ہیں پہلے سوال سے کہ ’جمہوریت‘ ہے کیا؟

سوال ا: جمہوریت کیا ہے؟

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ 'جمہوریت کیا ہے؟' کا جواب ہم اپنی کامن سینس سے دیں گے یا جس نظام فکروعمل نے اس نظریہ 'جمہوریت' کو جنم دیا ہے، اس سے پوچھیں گے؟

اصطلاحات کے معنی کیسے متعین ہوتے ہیں؟

سوال یہ ہے کہ کسی اصطلاح کے معنی ومفہوم کے تعین کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ ماضی میں مسلم ماہرین نے 'اصولِ فقہ' میں اور عصرحاضر میں مغرب کے پوسٹ ماڈرن فلسفیوں نے لفظ ومعنی کی دلالت پر جو تفصیلی بحثیں کی ہیں، اگر ہم ان کی تفصیل میں نہ بھی جائیں تو اتنی بات تو ہمارے اہل علم میں معروف ہی ہے کہ اصطلاح تو دور کی بات ہے ہر لفظ کا معنی اس زبان کا وہ لٹریچر مہیا کرتا ہے جو اس کے فلسفۂ علم، ورلڈ ویو اور بنیادی نظریات (جنہیں مغرب میں آئیڈیالوجی اور ہمارے ہاں عقائد کہا جاتا ہے) پر مبنی ہوتا ہے۔ ایک سادہ مثال سے ہم اپنی بات کی وضاحت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک اصطلاح ہے 'صلاۃ' اب مغربی تہذیب کے پیراڈائم میں پڑھا لکھا ایک شخص اگر 'صلاۃ' کا مفہوم سمجھنا چاہے تو کیا اس کے لیے کافی ہوگا کہ وہ دیکھے کہ 'صلاۃ' کا ترجمہ انگریزی میں عموماً Prayer سے کیا جاتا ہے اور لفظ Prayer کا جو مفہوم وہ اس لفظ سے مغرب کے تہذیبی، فکری اور لسانی پیراڈائم میں سمجھتا ہے، اس سے وہ اخذ کرلے کہ Prayer کے معنی دعا کرنے یا عبادت کرنے کے ہیں، جس طرح کی دعا وعبادت وہ ہفتے میں ایک دن چرچ میں جاکر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طریقے سے، جو پروفیسر ملک صاحب کے نزدیک 'کامن سینس' پر مبنی ہے کیا وہ صلاۃ کے صحیح مفہوم، طریقے، فلسفے تک پہنچ سکتا ہے؟ ہمارے خیال میں کوئی صاحبِ عقل اس کا جواب 'ہاں' میں نہیں دے سکتا!

اسی طرح اب لفظ 'جمہوریت' پر غور کیجیے۔ مغرب کی سیاسی فکر میں جو لفظ استعمال ہوا وہ ہے 'Democracy'۔ اب اگر آپ اس لفظ ڈیموکریسی کا صحیح مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں تو اسے مغرب کی سیاسی فکر کے تناظر میں ہی سمجھا جاسکتا ہے جو مبنی ہے مغرب کے فلسفۂ علم پر اور مغرب کے ورلڈ ویو اور اس کی آئیڈیالوجی پر۔ آیئے تکمیل بحث کی خاطر ہم لفظ ڈیموکریسی کی جڑوں میں اترتے ہیں کہ کس فکری پس منظر میں اس اصطلاح کی تشکیل ہوئی ور جس نے اس

کے مفہوم و معنی کا تعین کیا۔

مغربی فکر و تہذیب یا جدیدیت کی ابتداء تحریک نشأۃ ثانیہ سے ہوئی جب اہل مغرب قرون مظلمہ سے نکل کر علم و ترقی کے ایک نئے جہان میں داخل ہوئے۔ ان کی نئی فکر ملوکیت، جاگیرداری اور پاپائیت کے گٹھ جوڑ کے ردّ عمل پر مبنی تھی لہٰذا انہوں نے نہ صرف ملوکیت اور جاگیرداری کو ردّ کیا بلکہ انہوں نے مذہب کو بھی ردّ کر دیا۔ اور مذہب کے علمبرداروں کو ردّ کرنے کے بعد انہیں فکری طور پر پناہ ملی تو یونانی تہذیب کی اس فکر میں جو مذہب (وحی) کی رہنمائی سے محروم تھی اور انسانی عقل اور حسی علوم کی پیداوار تھی۔ اس ملحدانہ فکر نے 'ہیومنزم' کے فلسفے کا رنگ اختیار کیا۔ ہیومنزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان خود مختار ہے بلکہ مختار مطلق ہے۔ وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے بلکہ وہ اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ خود طے کرے کہ اس نے دنیا میں زندگی کیسے بسر کرنی ہے۔ یہ گویا God-centric کی بجائے Human-centric پیراڈائم کی ابتداء تھی۔ اس کے بعد جتنے ازم وجود میں آئے اور جتنے نظریات نے جنم لیا، وہ اسی بنیادی فکر کی توسیع تھے یا اس سے مستنبط شدہ تھے۔ **سیکولرزم** اس انسانی اختیار کا مظہر تھا کہ وہ جہاں چاہے مذہب کو مانے اور جہاں چاہے اسے ردّ کر دے۔ چنانچہ سیکولرزم کے علمبرداروں نے یہ طے کیا کہ فرد اپنی انفرادی زندگی میں مذہب کو اختیار کر سکتا ہے لیکن اجتماعی زندگی یعنی معاشرے اور ریاست کی سطح پر انسان کی اپنی مرضی چلے گی نہ کہ خدا، رسول، وحی اور مذہب کی۔ **لبرل ازم** یہ ہے کہ انسان کو لامحدود اور غیر مشروط آزادی حاصل ہے۔ وہ جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے۔ **کیپٹل ازم** اور **میٹریل ازم** یہ ہے کہ دنیا کی یہ زندگی ہی سب کچھ ہے۔ اس کی ترقی، اس کی آسائشیں اور سہولتیں ہی ساری انسانی جدوجہد کا ہدف ہونی چاہئیں کہ آخرت کسی نے نہیں دیکھی۔ **ایمپیر یسزم** یا **سائنٹیسزم** یہ ہے کہ علم کا منبع انسانی عقل اور اس کا حسی مشاہدہ اور تجربہ ہے نہ کہ وحی، مذہب اور کوئی آسمانی کتابِ ہدایت۔

یہ وہ بنیادی آئیڈیالوجی ہے جس سے مغربی تہذیب کا ورلڈ ویو کشید ہوتا ہے۔ جو یہ ہے کہ انسان خود مختار اور مختار مطلق ہے۔ وہ کسی بالاتر ہستی (خدا) کا عبد نہیں ہے جس کی بات اس کے لیے مستند ہو اور اتھارٹی رکھتی ہو۔ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے آخرت نہیں۔ اور علم کا منبع خود انسان اور اس کی عقل اور تجربہ و مشاہدہ ہے نہ کہ کوئی کتاب منزّل من السماء۔

اس ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم سے مغرب میں جو سیاسی فکر وجود میں آئی ہے اس کے اہم اجزاء ہیں: نیشنلزم، ڈیموکریسی، نیشن سٹیٹ تھیوری، آئین و پالیمنٹ کی بالادستی، بنیادی انسانی حقوق... وغیرہ۔ ہم یہاں صرف ڈیموکریسی کا جائزہ لیں گے جو اس وقت زیرِ بحث ہے۔

مغربی فکر وتہذیب میں ڈیموکریسی کا تصور یہ ہے کہ انسان چونکہ خود مختار ہے لہٰذا اس کے نمائندے بھی خود مختار ہیں جنہیں وہ حکومت کرنے اور قانون سازی کے لیے چنتے ہیں۔ انسان خود چونکہ حلال وحرام، خیر وشر اور حسن وقبح میں خود مختار ہے لہٰذا پارلیمنٹ میں اس کے نمائندے بھی خود مختار ہیں کہ عوام کی رائے کے مطابق جس چیز کو چاہیں حلال قرار دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام (چنانچہ مغرب کے پارلیمانوں میں عوام کے نمائندے جوئے، شراب، زنا بالرضا لواطت اور ہم جنس شادیوں کو حلال قرار دے چکے ہیں)۔ اس اصول پر مغرب کے سیاسی نظام میں آئین 'مقدس' ہے کیونکہ وہ عوام یا ان کے نمائندوں کا پاس کردہ ہوتا ہے اور عدلیہ اور حکومت کے سارے ادارے اس کے اتباع کے پابند ہوتے ہیں۔ کوئی آئین کے تقدس کو چیلنج نہیں کرسکتا (اور جو کرے اس کی سخت سزا ہے، سزائے موت یا عمر قید یا شہریت سے محرومی وغیرہ)۔ پارلیمنٹ سب اداروں سے سپریم ہے اور جو قانون چاہے وہ بنا سکتی ہے اس لیے کہ فرد خود مختار ہے اور وہ افراد/عوام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ ووٹر ہونے کی حیثیت سے اختیار حکام میں سب افراد برابر کے حق دار ہیں کیونکہ بحیثیت فرد وہ سب ایک جیسی مقتدر حیثیت کے مالک ہیں خواہ کوئی عورت ہو یا مرد، شریف ہو یا بدمعاش، جاہل ہو یا دانشور۔ اسی طرح ہر فرد نمائندگی کا اہل ہے اور اپنے آپ کو عوامی نمائندگی کے لیے پیش کرسکتا ہے اور اس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاسکتی (اِلّا یہ کہ افراد خود ہی کوئی قدغن لگالیں جیسے عاقل وبالغ ہونے کی شرط، مخصوص عمر اور تعلیم کا حامل ہونا وغیرہ۔

یہ ہے وہ ڈیموکریسی جو مغرب کے نظریات، اس کے ورلڈ ویو اور اس کے فلسفۂ علم کی پیداوار ہے، یہ انہی کی مظہر ہے اور انہی پر مبنی ہے۔

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا مغربی فکر وتہذیب کا ڈیموکریسی کا یہ تصور اسلامی ہے؟ کوئی صاحبِ عقل جو اسلام کو سمجھتا ہے اور جس نے سطورِ بالا میں ان

نظریات، ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کو جان لیا ہے جن کی پیداوار یہ الحادی اور سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے، اس کا جواب 'ہاں' میں نہیں دے سکتا۔

اب آیئے **تیسرے سوال** کی طرف کہ کیا مغربی فکر وتہذیب کے ڈیموکریسی کے تصور کو اسلامیایا جاسکتا ہے؟ یعنی کیا کوئی طریقہ ایسا ہوسکتا ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کی یہ ڈیموکریسی اسلام کے مطابق ہوجائے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ پہلے ہم یہاں اپنے موقف کے حق میں دلائل دیں گے اور اس کے بعد ان لوگوں کے موقف کا جائزہ لیں گے جو پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کی طرح یہ سمجھتے ہیں کہ مغربی فکر وتہذیب کی اس ڈیموکریسی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق یا پاکستانی تناظر میں ڈھالا جاسکتا ہے:

ا۔ اردو کے کسی ادیب اور مترجم نے 'ڈیموکریسی' کا ترجمہ 'جمہوریت' کر دیا۔ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ ناقص اور غلط ہے کیونکہ 'جمہوریت' کا لفظ ان سب تصورات کا احاطہ نہیں کرتا جو مغربی فکر وتہذیب میں لفظ 'ڈیموکریسی' سے وابستہ ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

i۔ اولاً کسی اصطلاح کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ہو نہیں سکتا جیسا کہ ہم نے پہلے 'صلاۃ' کی مثال دی کہ 'صلاۃ' کی شرعی اصطلاح کا انگریزی میں ایک لفظی ترجمہ ممکن ہی نہیں کیونکہ اس اصطلاح کا مفہوم انگریزی میں منتقل کرنے کے لیے ہمیں کئی جملے استعمال کرنے پڑیں گے اور پھر بھی شاید اس کا مفہوم کسی غیر مسلم کی سمجھ میں نہ آئے۔ اسی طرح 'اللہ' کا ترجمہ God نہیں ہوسکتا کیونکہ کوئی مغربی غیر مسلم شخص God کے لفظ کا جو مفہوم سمجھتا ہے اگر وہ وہی مفہوم لفظ 'اللہ' کا سمجھے تو بلاشبہ وہ غلط، ناقص اور محدود ہوگا۔

ii۔ جمہور ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی اکثریت کے ہیں۔ لفظ جمہوریت سے اس کے جو لغوی معنی سمجھے جاسکتے ہیں وہ اکثریت کی رائے کے ہیں جیسا کہ فقہی مسائل میں اکثر یہ الفاظ پڑھنے کو ملتے ہیں کہ ĩnÿLÚj ŹöEXĈEä/ nbŹXö ? Lç یعنی اس مسئلے میں اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ.... لیکن 'جمہوریت' کا لفظ بطور ایک سیاسی نظام اور بطور ایک سیاسی اصطلاح کے اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں، ہمارے علم کی حد تک، استعمال نہیں ہوا، لہٰذا جمہوریت کا لفظ بول کر اس سے اسلام کا سیاسی نظام ہرگز مراد نہیں لیا جاسکتا۔ مغربی فکر وتہذیب

میں 'ڈیموکریسی' کی اصطلاح سے جو مفاہیم وابستہ ہیں، ان کا اطلاق لفظ 'جمہوریت' پر نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ 'جمہوریت' عربی زبان میں سرے سے کوئی سیاسی اصطلاح ہے ہی نہیں۔ عربی زبان میں جمہوریت کا مطلب ہے اکثریت کی رائے لیکن یہ اکثریت 'حق' تخلیق نہیں کرتی بلکہ حق کی کسی تعبیر میں اختلاف رائے کو ظاہر کرتی ہے ورنہ ممکن ہے کہ ایک آدمی کی رائے اوفق بالقرآن والسنۃ ہو اور ۹۹ آدمیوں کی رائے غلط ہو مطلب یہ کہ اسلام میں (اور لغت کی رو سے) اکثریت/ جمہوریت معیارِ حق نہیں ہوتی بلکہ حق کی کسی خاص تعبیر میں کثرت رائے کی مظہر ہوتی ہے جو محض اس رائے کے باوزن ہونے کا ایک قرینہ ہے اور جو صحیح بھی ہوسکتا ہے اور غلط بھی جبکہ ڈیموکریسی میں فرد خود خدا ہے اور اس کے نمائندے بھی خدائی اختیارات کے حامل ہوتے ہیں اکثریت یہاں معیارِ حق ہوتی ہے اور حق کو تخلیق کرسکتی ہے۔ جس کی ایک مثال یہ ہے کہ کسی مغربی پارلیمنٹ میں اگر ۱۰۰ آدمی کہیں کہ سود ناجائز ہے اور ۹۰ آدمی کہیں کہ سود جائز ہے تو فیصلہ ۱۰۰ آدمیوں کی رائے کے مطابق ہوگا کیونکہ وہ اکثریت میں ہیں۔ اسلام میں اس کے برعکس اگر دنیا کے پونے دو ارب مسلمان سب مل کر بھی کہیں کہ سود جائز ہے تو اسلام کی رو سے سود جائز نہیں ہوگا کیونکہ یہاں اکثریت نہ حق تخلیق کرسکتی ہے اور نہ وہ معیارِ حق ہوتی ہے۔

iii۔ کسی بھی فکری پیراڈائم پر مبنی اصطلاح کا مفہوم 'کامن سینس' کی بنیاد پر اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈیموکریسی مغرب فکر وتہذیب کی ایک اصطلاح ہے لہٰذا اس کا صحیح مفہوم صرف وہ ہے جو مغربی فکر وتہذیب میں متداول ہے۔ اس کے علاوہ اس کا جو مہفوم بھی لیا جائے گا وہ غلط ہوگا کیونکہ ڈیموکریسی ایک لفظ نہیں ایک سیاسی اصطلاح ہے جس کا مغربی فکر وتہذیب میں ایک خاص مفہوم ہے۔ ہم ڈیموکریسی کا ترجمہ اسی لیے 'مغربی جمہوریت' کرتے ہیں کیونکہ خالی 'جمہوریت' سرے سے کوئی اصطلاح ہے ہی نہیں بلکہ اصل اصطلاح ڈیموکریسی ہے جس کا اردو میں قریب ترین مفہوم یہی ہوسکتا ہے کہ 'مغربی فکر وتہذیب پر مبنی جمہوریت' یا اختصار کے لیے 'مغربی جمہوریت'۔

iv۔ اسلام ایک انڈی پنڈنٹ فکر وتہذیب ہے جس کی اپنی اصطلاحات ہیں جو اپنا ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں۔ 'اللہ' اور 'صلاۃ' کی اصطلاحات کا ذکر سطور بالا میں گزر چکا، اسلام

کی سیاسی اصطلاح 'خلافت' ہے جس میں بنیادی تصور یہ ہے کہ مسلم حکمران آمر اور مطلق العنان حکمران نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا عبد اور خلیفہ ہوتا ہے۔ ماڈل خلافت تو 'خلافت راشدہ' کا سیاسی نظام تھا لیکن بعد کے ادوار میں بری بھلی خلافت بھی دو خصوصیات سے خالی نہ تھی: ایک تو اس میں شریعت بالا دست تھی اور کسی مسلم حکمران نے کبھی اس کو چیلنج کرنے کی جرأت نہیں کی۔ اس کے نتیجے میں قرآن وسنت ریاست کا مقدس دستور ہوتا تھا۔ اور دوسرے اس میں ساری مسلم دنیا متحد تھی۔ مسلمان زوال پذیر ہوئے تو مغرب نے اپنے گماشتوں کے ذریعے 'خلافت' ختم کرادی اور اب وہ کسی مسلمان ملک کو 'خلافت' کا نام بھی نہیں لینے دیتا کہ کہیں شریعت بالادست نہ ہو جائے اور کہیں عالم اسلام متحد نہ ہوجائے۔ اس 'خلافت' میں اور مغربی فکر وتہذیب کی ڈیموکریسی میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ کون سی دانش، کون سی منطق اور کون سی کامن سینس ہے جو یہ کہتی ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کی ڈیموکریسی اور اسلام کا سیاسی نظام 'خلافت' ایک دوسرے کے قریب ہیں، یہ ایک جیسے دو سیاسی نظام ہیں یا ان کو باہم ملایا جاسکتا ہے؟

ان بنیادی اختلافات کی موجودگی میں اگر بعض جزئیات میں قربت ہو بھی جیسے مسلمان حکمران بھی مسلم رعایا کی مشاورت سے حکمران بنتا ہے اور وہ بعد میں بھی مشاورت کا پابند ہوتا ہے یا عوام کی رائے جاننے کے لیے آج مسلم دنیا میں بھی انتخابات کرانے کا سوچا جاسکتا ہے۔ اس سے اسلام کا سیاسی نظام 'خلافت' اور مغربی فکر وتہذیب کی ڈیموکریسی ایک جیسے نہیں ہوجاتے۔

v۔ مغرب کی تہذیب چونکہ اس وقت بالا دست ہے اور اپنے سیاسی، حربی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی.... غلبے کی وجہ سے ساری دنیا کو، خصوصاً مسلم ممالک کو، اپنے رنگ میں رنگنا چاہتی ہے لہٰذا اس نے بڑی منصوبہ بندی، ہنرمندی، مینا کاری، میڈیا کے پروپیگنڈے سے اور سیاسی، معاشی، حربی، تعلیمی، ثقافتی دباؤ سے اپنے نظریات اور اداروں کو بہترین اور انہیں آج کی دنیا کے لیے ناگزیر قرار دیا ہوا ہے۔ جاپانی نژاد امریکی فلاسفر فوکو یاما اپنی کتاب *The End of the History and the last Man* میں جمہوریت کو انسانی سیاسی تجربے کی معراج اور اعلیٰ ترین صورت قرار دیتا ہے جس کے بعد کسی اور بلندی کا تصور بھی نہیں

کیا سکتا۔ مغرب نے اپنے پروپیگنڈے سے جمہوریت کو'روحِ عصر'بنا کر اور ایک ایسا مقدس عقیدہ بنا کر پیش کیا ہے جو آج انسانیت کے لیے ناگزیر ہے اور یہ سب اس کی اپنی تہذیب کی یونیورسلائیزیشن کی ایک منصوبہ بند کوشش ہے جس سے مقصود اپنی فکری اور تہذیبی برتری ہے۔ اپنی جمہوریت کے حق میں مغرب کے اس شدید پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں خصوصاً مسلمانوں میں (جن میں مغرب کی فکری غلامی عام ہے) مغربی جمہوریت کی مخالفت کرنا گویا نکّو بننے اور تماشا بننے کے مترادف ہے۔ چنانچہ ہم جیسے چند سرپھروں کے سوا، عالم اسلام میں اور پاکستان میں کوئی مسلمان سیاستدان، عالم اور دانشور مغربی جمہوریت کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

vi۔ قرآن وسنت کی سیاسی تعلیمات کے حتمی، غیر متبدل اور مقدس ہونے کے باوجود ہم اقرار کرتے ہیں کہ تہذیبیں ہوا بند خانوں (Air Tight Compartments) میں پروان نہیں چڑھتیں بلکہ وہ اپنے سے پہلے کی تہذیبوں اور اپنی معاصر تہذیبوں سے تھوڑا بہت استفادہ بہر حال کرتی ہیں۔ ہمیں اس بات کے تسلیم کرنے میں عار نہیں لیکن یہاں چند باتیں ملحوظ رکھنی چاہئیں:

❁ ایک تہذیب کسی ایسی تہذیب ہی سے 'محتاط' استفادہ کرسکتی ہے جو نظریاتی لحاظ سے اس کے قریب ہو جیسے آسمانی مذاہب کی پیدا کردہ مختلف تہذیبیں مثلاً امت محمدی کا سنن ابراہیمی کا اتباع کرنا۔

❁ ایک تہذیب کسی دوسری ایسی تہذیب سے زیادہ استفادہ نہیں کرسکتی جو اس کی نظریاتی مخالف ہو جیسے اسلامی تہذیب نے یونانی تہذیب سے زیادہ استفادہ نہیں کیا۔

❁ ایک تہذیب کسی مخالف تہذیب کی ایسی کوئی چیز نہیں لے سکتی جو Value Loaded ہو یعنی مخالف تہذیب کے ورلڈ ویو کی براہ راست پیداوار ہو جیسے اسلامی تہذیب یونانی تہذیب کے کھیلوں کے تصور کو نہیں اپنا سکتی کیونکہ ان کا تعلق یونانی تہذیب کے غلط مذہبی نظریات وتصورات سے ہے۔

❁ پس اسلامی تہذیب مغربی تہذیب کے سیاسی نظام جمہوریت کو نہیں اپنا سکتی کیونکہ

جمہوریت مغربی تہذیب کے ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم اور کیپٹل ازم (نظام سرمایہ داری) جیسے غیر اسلامی اورالحادی تصورات کی پیداوار ہے جو اسلام کے براہ راست نقیض ہیں۔

تاہم اسلام کا سیاسی نظام مغربی جمہوریت کے کسی ایسے جزیئے کو قبول کرسکتا ہے جو انسانی تجربات پر مشتمل ہو اور اسلام کے کسی منصوص حکم اور اس کے مقاصد کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً حکومتی اختیارات کی مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں تقسیم۔ چونکہ اسلام اس بارے میں کوئی واضح حکم نہیں دیتا لہٰذا عصر حاضر میں مسلم فقہاء و مجتہدین اس مسئلے پر اجتہادی رائے قائم کرتے وقت مغرب کے سیاسی تجربات کو سامنے رکھ سکتے ہیں اور ان کی کوئی چیز اگر Value Loaded نہ ہو تو اس سے محتاط استفادہ کرسکتے ہیں اور اسے لے کر اپنے رنگ میں ڈھال سکتے ہیں جیسے حضرت عمرؓ نے اہل فارس کا نظامِ دیوان (بطور Administrative package) قبول کرلیا تھا اور اس میں اپنے اصول و اقدار کے مطابق ضروری تبدیلیاں کرلی تھیں اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے حضرت عمرؓ کے اس اقدام کی مخالفت نہیں کی۔

ان دلائل کی بنیاد پر ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی ڈیموکریسی یا مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے اور اسے اسلامیا یا نہیں جاسکتا اور نہ اس میں کوئی اسلامی تبدیلیاں کرکے اسے اسلام کے مطابق بنایا جاسکتا ہے اور نہ اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دے کر قبول کیا جاسکتا ہے۔

ہماری اس بحث سے برادرم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کا وہ مقدمہ بھی ختم ہو جاتا ہے کہ کامن سینس کی رو سے جمہوریت نہ اچھی ہے اور نہ بُری بلکہ جمہوریت اگر مغربی تہذیب کے مطابق ہوگی تو ہم مسلمانوں کے لیے ناقابل قبول ہوگی لیکن اگر جمہوریت اسلامی اصولوں پر استوار ہو تو وہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہونی چاہیے۔

تاہم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب کے اس نتیجے سے ہمیں اتفاق ہے کہ مزعومہ 'اسلامی جمہوریت' سے بھی پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ صحیح تعلیم و تربیت سے افراد قوم کی ذہن سازی اور کردار سازی نہ کی جائے۔ اس کے لیے موجودہ نظام تعلیم کی اصلاح ناگزیر ہے جس کے البرہان اور اس کے مدیر ڈاکٹر محمد امین صاحب علمبردار ہیں۔

یہاں ہماری بات مکمل ہوگئی لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ذہین قاری کے ذہن میں یہاں ایک سوال ضرور پیدا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اگر مغربی جمہوریت غیر اسلامی ہے تو ہمارے علماء وسکالرز نے اس میں چند اسلامی اصول داخل کر کے اسے ’اسلامی جمہوریت‘ کیوں قرار دیا اور اس کے تحت ہماری دینی سیاسی جماعتیں کیوں جدوجہد کررہی ہیں؟ اس شبہے کا ہم یہاں مختصر جواب دیں گے۔

اس سوال کا جواب ہم اگر اصولی بنیادوں اور ہمدردانہ انداز میں دیں تو ہم کہیں گے کہ جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا، یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی لہٰذا انہیں اس پر مطعون نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مجتہد اگر غلطی بھی کرے تو مستحقِ اجرِ واحد ہوتا ہے۔ تاہم اگر اس سوال کا جواب تحلیلی اور تنقیدی انداز میں دیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ فیصلہ کیا وہ مغربی فکر سے مرعوب ہو گئے تھے۔ ہم اگر اس وقت سن رشد کو پہنچے ہوئے ہوتے جب ۱۹۴۸ء میں مولانا مودودیؒ اور ۱۹۵۱ء میں ۳۱ علماء کرام اپنے ۲۲ نکات میں اس کی حمایت کررہے تھے تو ہم یقیناً اُس وقت بھی اس فیصلے کی مخالفت کرتے اور ان علماء کرام سے مطالبہ کرتے کہ وہ پہلے تو مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت کو غیر اسلامی قرار دے کر اسے رد کرنے کا اصولی فیصلہ کریں پھر مل کر عصر حاضر میں اسلام کے سیاسی نظام کا ایک واضح نقشہ مرتب کریں اور اسے روبہ عمل لانے کی کوشش کریں۔

ان کے اجتہادی فیصلے کے غلط ہونے کا زندہ ثبوت یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں پاکستان میں مغربی جمہوریت آ گئی ہے اور سیکولرزم، لبرل ازم اور بے دینی معاشرے پر غالب آ گئی ہے اور اسلام نافذ نہیں ہوا اور معاشرہ بحیثیت مجموعی دین کے قریب نہیں ہوا اور ہزیمت اور ناکامی دینی سیاسی قوتوں کا مقدر بنی ہے۔ اگر وہ اُس وقت (یعنی قیام پاکستان کے فورا بعد) مغربی فکر وتہذیب کو رد کرنے کا فیصلہ کرتے اور تعلیم کتاب وحکمت وتزکیۂ نفوس کی پیغمبرانہ پالیسی کے تحت فرد ومعاشرے کی اسلامی اصولوں کے مطابق تعمیر واصلاح میں جت جاتے اور پھر ان کی قوت سے ریاست کو اسلامی بنانے کی جدوجہد کرتے تو ہمیں یقین ہے کہ آج پاکستان میں اسلامی نظام نافذ ہوتا اور غلبۂ دین کی منزل اتنی دور نہ ہوتی جتنی آج ہے۔ هذا من عندنا والعلم عند الله.

اسلام اور پاکستان مدیر

ہم عجیب لوگ ہیں۔ پہلے بد پرہیزی کرتے ہیں پھر بیمار ہونے پر علاج کرواتے ہیں

ہمارے سیاسی نظام کی بوالعجبیاں

نیچے سے اوپر تک سارا نظام غیر اسلامی، اوپری سطح پر دفعہ ۶۳ کے ذریعے ایک جزیے کی اسلام کاری

پتا نہیں ضیاء الحق مرحوم کو معلوم نہ تھا، علماء نے اور کسی دانشور نے انہیں بتایا نہیں یا انہیں معلوم تھا لیکن سیاسی مصلحتوں اور بین الاقوامی دباؤ کی وجہ سے اس پر عمل نہ کر سکے کہ ریاست کو اوپر سے اسلامیا یا نہیں جا سکتا، نہ آئین تبدیل کر کے اور نہ نئے اسلامی قوانین بنا کر، بلکہ تبدیلی کی اساس فرد ہے جب تک تعلیم وتربیت کے ذریعے، دعوت واصلاح کے ذریعے، ذرائع ابلاغ کے ذریعے فرد کو تبدیل نہ کیا جائے اس کے دل ودماغ کو اسلام پر عمل کے لیے آمادہ نہ کیا جائے ریاست اسلامی ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ دیکھیے کہ انہوں نے ۱۹۷۹ء میں ملک میں حدود نافذ کر دیں لیکن ہم میں سے ہر کوئی جانتا ہے کہ ان حدود پر عمل نہیں ہو رہا۔ کسی چور کا آج تک ہاتھ نہیں کٹا، کسی زانی کو آج تک کوڑے نہیں لگے۔ کیوں؟ اس لیے کہ عدالتیں ان احکام پر عمل نہیں کرنا چاہتیں، نہ وکیل اور نہ پولیس کرنا چاہتی ہے۔ عوام بھی بے حس ہیں اور انہیں پروا نہیں کہ ان پر عمل ہوتا ہے یا نہیں!

اب بوالعجبی دیکھیے کہ آئین کی دفعہ ۶۲ یہ چاہتی ہے کہ پارلیمنٹ میں وہ لوگ نہ جائیں جو اسلامی حوالے سے اپنے اخلاق وکردار کی رو سے اس کے اہل نہ ہوں لیکن اس دفعہ پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کراتا۔ نہ ریٹرننگ افسر، نہ امیدواران، نہ کوئی دینی سیاسی جماعت، نہ کوئی عدالت۔ پھر جب نااہل لوگ پارلیمنٹ پہنچ جاتے ہیں تو سیاسی مقاصد کے لیے ان کو عدالت سے غیر امین اور غیر صادق ڈیکلیئر کرا کے انہیں نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ کوئی اور اگر اس کو اہمیت نہ بھی دے تو دینی عناصر خصوصاً دینی سیاسی جماعتوں کو اسے موت اور زندگی کا معاملہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر چور اُچکے، ڈاکو، بدکردار، جاہل، سیکولر، لبرل لوگ اسمبلیوں میں پہنچیں گے تو وہ لازماً ملک میں نفاذ شریعت کی مخالفت کریں گے اور اگر نیک اور دین دار لوگ اسمبلیوں میں پہنچیں گے تو وہ ان کے دست وبازو بنیں گے خواہ ان کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو۔

لیکن اس کے لیے بڑی محنت اور ہوم ورک کی ضرورت ہے اور ہر انتخابی حلقے میں متحرک کارکنوں کی ایک ٹیم درکار ہے جو مقامی سیاسی رہنماؤں اور متوقع اُمیدواروں کا کٹھا چٹھا جمع کرتی رہے اور ان کی نامزدگی کے وقت ریٹرننگ افسروں کو پیش کرے اور انہیں انتخابات میں حصہ لینے سے نا اہل قرار دلوائے۔

عملاً صورت حال یہ ہے کہ والدین بچوں کی اسلامی تربیت نہیں کرتے، سکول کالج یونیورسٹی کا سارا نظام تجارت پر مبنی اور مغرب زدہ ہے۔ وہ بچوں کے اخلاق بگاڑتا ہے، سنوارتا نہیں۔ مخلوط تعلیم، درسگاہوں میں کھلا ڈھلا ماحول (کنسرٹ، مینا بازار، میوزک، فیشن شوز) خود اساتذہ کی تربیت کا نظام ندارد۔ یہ پود جوان ہو کر زندگی کے جس شعبے میں جاتی ہے کرپشن کرتی ہے، بے ایمانی کرتی ہے، دو نمبری اس کا معمول ہے۔ رہی سہی کسر مغرب زدہ میڈیا نکال دیتا ہے جو دن رات فحاشی، عریانی، زر پرستی اور حرام کاری کو فروغ دے رہا ہے۔ اس ماحول میں جو لوگ اسمبلیوں میں جائیں ان سے صادق و امین ہونے کی توقع کرنا ایسے ہی ہے جیسے تھوہر بو کر گلاب اگنے کی توقع کی جائے۔ لیکن ہم عجیب لوگ ہیں بیماری کے اسباب کو دور نہیں کرتے، پرہیز نہیں کرتے بلکہ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرنے پر تلے ہوئے ہیں پھر جب بیمار پڑتے ہیں تو کہتے ہیں اب ہمیں علاج کی ضرورت ہے! کوئی ہے سوچے؟

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
خاور کے ثوابت ہوں کہ افرنگ کے سیّار!

پیرانِ کلیسا ہوں کہ شیخانِ حرم ہوں
نَے جدّتِ گفتار ہے نَے جدّتِ کردار!

ہیں اہلِ سیاست کے وہی کہنہ خم و پیچ
شاعر اُسی افلاسِ تخیل میں گرفتار!

دُنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار!

(اقبالؒ)

اسلام اور پاکستان حامد کمال الدین

پاکستانی سیاست: دینی قوتوں کے لیے نئے لائحہ عمل کی تلاش

ہماری نظر میں، اسلامی سیکٹر کے پاس بطورِ پارٹی سیاست میں آنے کے لیے اس وقت دو آپشنز ہیں۔ ایک: 'مذہبی پارٹی' یا پارٹیوں کے اتحاد کے طور پر سامنے آنا۔ دوسرے: ایک 'مین اسٹریم پارٹی' کے طور پر سامنے آنا۔ جبکہ تیسرا آپشن اس وقتی صورتحال میں، کہ جب یہ دونوں آپشنز (ہماری رائے میں) خالی ہیں، ایسی سیاسی صلاحیتیں رکھنے والے 'افراد' کے لیے ہے جو معاشرے کے مین سٹریم کو ساتھ چلانے سے مطابقت رکھتے ہوں۔ (یعنی تیسرا آپشن بطور فرد ہے نہ کہ بطور پارٹی)۔ ذیل میں اس کی کچھ وضاحت کی جاتی ہے:

مذہبی پارٹی کے طور پر سامنے آنے کے لیے درکار ڈائنامکس

مذہبی گیٹ اپ کے ساتھ سیاست میں آنے کی صورت میں یہاں آپ کے لگانے کا نعرہ 'اسلام' ہی ہے اور 'اسلام' کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی 'اسلام' کے نام پر ہی آپ یہاں مذہب کے متوالوں میں ایک (مثبت معنیٰ کی) جنونیت پیدا کریں؛ ''اسلام'' کی بنیاد پر ہی سٹیٹس۔کو پارٹیوں کے ساتھ آپ ایک ''رزمیہ'' کھڑا کریں (جو کہ آپ نے آج تک کھڑا نہیں کیا۔ الٹا آپ میں سے کئی ایک، سٹیٹس۔کو پارٹیوں کے ساتھ بیٹھے رہے، ممتاز قادریؒ کو پھانسی اور 'لبرل بھگوان' کی مسلسل بلائیں لیے جانے کے علی الرغم، جمہوریت ایسے 'اعلیٰ تر' مقصد کے لیے اپنے ان سب اسلامی مفادات کی قربانیاں دیتے ہوئے۔ حقیقت میں، ایک ''اسلامی صدا'' کے طور پر یہ اِس ملک میں آپ کی موت تھی، اگرچہ ایک مذہبی انجمن کے طور پر آپ کچھ پھل پھول لیے ہوں، یا آئندہ بھی سیاست کے کچھ 'رخنے' پُر کرتے دیکھے جائیں۔

معلوم ہونا چاہیے، پاکستانی سیاست میں یہ اسامی اِس وقت مکمل طور پر خالی ہے (''اسلام'' کا نعرہ لگا کر سیاست میں آنے کی اسامی)، خواہ اسے کوئی پُر کر لے، شرط صرف یہ ہے کہ اس کے لیے چہرہ جاندار ہو اور مذہبی جنونیت کے ساتھ ذرا ایک درجہ مطابقت رکھتا ہو۔ اور قابل ترجیح یہ کہ کسی ایک مسلک کی پوری طاقت لے کر آ سکتا ہو (ایک سے زیادہ مسلک کے

جنونی مل کر آ جائیں تو سونے پر سہاگہ۔ ورنہ ایک بھی کافی ہے۔ اصل چیز ہے مذہبی دیوانگی اور یکسوئی کے تار چھیڑ سکنے کی صلاحیت۔ یقین کیجیے، مذہب کے متوالوں کو آپ میں اگر یہ چیز نظر آ گئی تو وہ 'دوسرے مسلک' کا ہونے کے باوجود آپ کے مسلکی تعصب تک سے صرفِ نظر کر لینے پر تیار ہوں گے۔ اس قدر پیاس ہے اِس جنسِ گراں مایہ کے طلبگاروں کے اندر۔

'جمہوریت' اور 'کرپشن' وغیرہ کے لیے پریشان نظر آنے والے چہرے البتہ اِس آسامی کے لیے مس فٹ رہیں گے کیونکہ مذہب کے متوالوں میں یہ ایشوز (جمہوریت، کرپشن وغیرہ) اس درجہ پذیرائی نہیں پا سکتے کہ وہ ان چیزوں کے لیے جذبات میں آ جائیں۔ اور جن طبقوں میں یہ نعرے (جمہوریت، کرپشن وغیرہ) پذیرائی پا سکتے ہیں وہ آپ کے مذہبی حلیے کو ووٹ دینے والے نہیں۔ لہٰذا ان ایشوز پر خاص آپ (مذہبی لوگوں) کا چیخنا چلانا سیاسی طور پر فضول ہے۔ یہاں (''اسلام'' کا ایک دیوانہ وار نعرہ لگانے کے حوالے سے) وہ چہرہ فٹ رہے گا جو صرف مذہبی ایشوز کے لیے درد ظاہر کرتا رہا ہو۔ (مذہبی شخصیات کے ہاں لوگ اس کے سوا کسی چیز کے متلاشی نہیں؛ یہ ایک واقعہ ہے۔ خادم رضوی صاحب کی مثال بھی اس معاملہ میں خاصی متعلق (relevant ہے)۔ غرض ایک ٹھیٹ غیر مفاہمتی مذہبی نعرے کے ساتھ، سیاست میں کسی قدر کامیابی حاصل کر لینے کا امکان موجود تو ہے، اگر آپ میں اس کی ہمت ہو۔ اس (مذہبی رزمیہ) کے طلبگار، معاشرے میں مفقود بہر حال نہیں ہیں۔ مذہبی حلیے کے ساتھ سیاست میں جو نعرہ آپ کو سب سے بڑھ کر سوٹ کرتا ہے وہ 'مذہب' ہی ہے (مذہب کے نام پر دیوانہ ہو سکنے والے عوامی طبقوں کو فی الحال مذہب کے ساتھ کسی اور چیز کا ٹانکا پسند نہیں ہے، خواہ یہ حقیقتِ واقعہ آپ کو اچھی لگے یا بری)۔

خلاصہ یہ کہ ایک خالص مذہبی نعرے کو بھی کچھ کامیابی یہاں مل ضرور سکتی ہے۔ بالکل خالی رہنے والی بات یہ نہیں ہے۔ خالی وہ رہیں گے جو کسی ایک بھی نعرے کی قیمت دینے پر آمادہ نہیں یا جو کئی نعروں کی بیک وقت قیمت دینے چل دیں گے۔ ایسے لوگ، واللہ اعلم، نری مشقت کے لیے ہیں۔ خصوصاً اگر وہ موقع پرست بھی نہیں ہیں، پھر تو سیاست میں ان کا کوئی بھی کام نہیں ہے۔ (نری خدمتِ خلق وہ سیاست سے باہر رہ کر بھی کر سکتے ہیں؛ یہاں سیاست میں کسی کسی کو بیگار دینا کیا ضروری ہے؟) یہ یاد رہے کہ ہر نعرہ ایک لانگ ٹرم انوسٹمنٹ

ہوتی ہے، یعنی ایک عرصہ اس کی ایک قیمت دی جاتی ہے اور ذرا محنت اور صبر کے بعد اس کی فصل آنے لگتی ہے۔ یہ رہا ایک رُوٹ، اگر آپ کو مذہبی فیس (religious face) کے ساتھ میدان میں اترنا ہے۔

مین اسٹریم پارٹی کے طور پر سامنے آنے کے لیے درکار ڈائنامکس

ہاں اگر آپ 'مذہبی ایشوز' کی بجائے 'پاپولر' نعروں کا روٹ اختیار کرنا چاہتے ہیں، جیسے قومی ترقی، انصاف، کرپشن کا خاتمہ، گڈ گورننس، مہنگائی کا خاتمہ، بجلی گیس وغیرہ کے بحران پر قابو، عورتوں کے حقوق یا مسائل وغیرہ، اور جو کہ ایک مین سٹریم پارٹی بننے کے لیے بوجوہ درکار ہے (ہم خود مانتے ہیں؛ اور یہ میدان دین بیزار پارٹیوں کے لیے چھوڑنے کا ہرگز نہیں ہے)... تو اس صورت میں بہتر یہ ہوگا کہ آپ مذہبی پیکنگ کے بغیر سیاست میں آیئے۔ (یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں، محض زمینی حقائق کے حوالے سے بات ہو رہی ہے)۔ اسی لیے، اپنی ایک گزشتہ تحریر (''آپ فی الوقت ان دونوں پارٹیوں کے سوتیلے ہیں'') میں ہم یہ کہہ چکے کہ پاکستانی سیاست میں اردگان ٹائپ ایک ڈویلپمنٹ درکار ہے جو اپنا جذبہ aspiration, motivation تو مذہب سے لے رہی ہو لیکن اپنے ساتھ لوگوں کو چلا سکنے کے حوالے سے وہ معاشرے کے ہر ہر طبقے کی پارٹی ہو۔ یعنی صرف مذہبی لوگوں کو ساتھ چلا سکنے والی نہیں بلکہ صحیح معنیٰ کی ایک مین سٹریم پارٹی (جس میں ڈاڑھی نہ رکھنے والے اور نقاب نہ کرنے والیاں اُتنی نسبت سے ہوں جتنی نسبت سے وہ آپ کے اس معاشرے میں بالفعل پائے جاتے ہیں۔ اسے ہم کہیں گے 'مین سٹریم کی ایک سیاسی پارٹی جو صرف aspiration اسلام سے لیتی ہو مگر اپنے ساتھ چلاتی سب کو ہو اور ہر طرح کے مرد عورتیں معاشرے میں اس کا پرچم اٹھائے کھڑے ہوں'، جو کہ ہمارا اسلامی سیکٹر ابھی تک پاکستان کو نہیں دے سکا)۔ خاصے یقین سے کہا جاسکتا ہے، ایسی ایک پارٹی ان شاء اللہ یہاں سب کو کھا جائے گی۔

پس اسلامی سیکٹر کے ''پارٹی'' کے طور پر سامنے آنے کے لیے تو یہ دو ہی منہج (mode) ہو سکتے ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ پاکستان ایسے ملک میں یہ دونوں بیک وقت بھی ہو سکتے ہیں، بلکہ ہونے چاہئیں، (الگ الگ طور پر) جہاں یہ دونوں اپنی اپنی سمت سے اسلام کو اس ملک میں اچھا راستہ بنا کر دیتے چلے جائیں۔ (بقیہ: ۵۸)

اسلام اور پاکستان　　سید خالد جامعی

اقتدار میں آئے بغیر بھی اصلاحات ممکن ہیں

جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی جماعتوں کی توجہ کے لیے

جناب سراج الحق نے یوم مئی پر فرمایا کہ کسانوں کی محنت کا پھل جاگیردار اور وڈیرے کھاتے ہیں اور مزدوروں کی خون پسینے کی کمائی پر سرمایہ دار عیش کر رہا ہے۔ سرمایہ داروں کی فیکٹریاں اور کارخانے بڑھتے رہے جبکہ مزدوروں کی خون پسینے کی کمائی پر سرمایہ دار عیش کر رہے ہیں۔ مزدور کے گھر کا چولہا بھی بجھ گیا۔ جس معاشرے میں مزدور کی عزت نہ ہو وہ معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔

جب ریل چلتی تھی تو ہر طرف ریل پیل تھی اور ریلوے مزدور بھی خوشحال تھا، لیکن جب حکمرانوں نے اس قومی ادارے کو اپنی من مانیوں کا مرکز بنالیا تو نہ صرف ریل کا پہیہ رُک گیا بلکہ ریلوے ملازمین کے گھروں کے چولہے بھی ٹھنڈے ہو گئے اور پھر حکمرانوں نے ان مزدوروں کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی اقتدار میں آ کر مزدوروں کو کارخانوں، فیکٹریوں اور کسانوں کو کھیتوں کی پیداوار میں شامل کرے گی۔ نبی مہربان ﷺ مزدوروں سے بہت محبت کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے غزوۂ خندق کھودنے میں مزدوروں کی طرح کام کیا۔ سیاست دان جاگیردار، سرمایہ دار محنت کشوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ [فرائیڈے اسپیشل ۴ مئی ۲۰۱۸ء]

یوم مئی پر جناب سراج الحق کے طبقاتی خیالات آپ پڑھ لیجیے۔ اسلام نے انسان کو عبد بنایا ہے امیر غریب سب عبد ہیں۔ مزدور کسان جاگیردار کی طبقاتی تقسیم تو سوشلزم کی تقسیم ہے۔ کیا اس تقسیم اور ایسی اصطلاحات کو اسلامی روایت وتہذیب میں استعمال کرنا مناسب بھی ہوگا؟ اسلام طبقاتی نظام زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہاں سب عبد ہیں اللہ کے کنبے والے۔ سب سے بہترین وہ ہے جو اس کے کنبے کی نگرانی و پرورش کرے۔

کیا اس فلسفے کو مان لیا جائے کہ تمام سرمایہ دار اور جاگیردار، مزدوروں اور غریبوں کے دشمن ہوتے ہیں؟ تمام مذہبی جماعتوں، اسلامی تحریکوں میں سرمایہ دار، جاگیردار، صنعت کار

شامل ہیں تو کیا یہ سب مزدوروں کے دشمن ہیں؟ اگر ہیں تو اسلامی جماعتوں میں یہ ظالم کیا کر رہے ہیں؟ ظاہر ہے یہ مبالغہ ہے۔ پاکستان کے ایک بڑے جاگیردار نواب مشتاق احمد گورمانی جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے تھے تو کیا وہ کسانوں کے دشمن تھے؟ ظاہر ہے ایسا بالکل نہیں۔ بہت سے سرمایہ دار جاگیردار صنعت کار نیک لوگ ہوتے ہیں لیکن عموماً امیر لوگوں کا اخلاقی حال بہتر نہیں ہے۔ وہ شحِ نفس کے مرض میں مبتلا ہیں اور انفاق کو اسراف سمجھتے ہیں۔ اس کے ذمہ دار بھی ہمارے علماء اور اسلامی جماعتیں ہیں۔ اقتدار میں آ کر معاشی اصلاحات کرنے کی بجائے کیا جماعت اسلامی اور دیگر اسلامی جماعتیں اور صوفی حلقے اپنے امراء صنعت کار سرمایہ داروں کو ہدایت نہیں دے سکتے؟ ان کی اصلاح نہیں کر سکتے؟

۱۹۹۳ء میں قاضی حسین احمد مرحوم نے اسلامک فرنٹ بنایا تو اعلان کیا کہ ہر مزدور کی کم از کم تنخواہ تین ہزار روپے ہوگی۔ اس وقت ہماری تنخواہ صرف اٹھائیس سو روپے تھی۔ ہمارے گھر میں ایک عورت گھریلو کام کرنے آتی تھی اور ہم خوف زدہ تھے کہ اگر اس خادمہ کو تین ہزار روپے تنخواہ دی جائے گی تو ہم کیا کھائیں گے؟ بلکہ تنخواہ دینے کے لیے مجھے دو سو روپے کسی سے ہر مہینے ادھار لینا پڑے گا۔ یہ ادھار کیسے ادا ہو گا؟

ہمارے فلیٹ کے پڑوس میں راجہ رحمت خان صاحب کا پٹرول پمپ تھا۔ راجہ صاحب نہایت نیک، صاحب ایمان، بے باک اور سچے آدمی تھے۔ جماعت اسلامی سے تعلق تھا۔ ہم دوپہر ان کے پٹرول پمپ پر گئے اور عرض کیا کہ راجہ صاحب! کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ ہم اپنی تمام تنخواہ مزدور کو دے دیں؟ میرے گھر میں جو عورت کام کرنے آتی ہے اسے تین ہزار روپے دے دوں گا تو میں کیا کھاؤں گا؟ گھر کا کرایہ بارہ سو روپے ہے وہ کہاں سے دوں گا؟ انہوں نے زور کا قہقہہ لگایا اور بہت دیر تک ہنستے رہے۔ چونکہ ان سے بے تکلفی تھی اس لیے ہم نے ان سے پوچھا کہ راجہ صاحب! پمپ پر مزدوروں کو آپ کتنی تنخواہ دیتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہزار گیارہ سو روپے۔ ہم نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ مزدوروں، غریبوں کی تنخواہ بڑھانے کے لیے کیا جماعت اسلامی کا اقتدار میں آنا ضروری ہے؟ جب تک آپ کو اقتدار نہ ملے مزدوروں کو تنخواہ کم ہی ملے گی؟ آپ قاضی صاحب کے مشورے کے مطابق اپنے پمپ پر آج سے تمام مزدوروں کی تنخواہ تین ہزار روپے کر دیجیے کیوں کہ قاضی صاحب تنخواہ کے لیے رقم

حکومت کے خزانے سے تو نہیں دیں گے، سرمایہ داروں کے منافع میں سے ہی دلوائیں گے۔ ہاں سرمایہ داروں کا منافع بس کم ہو جائے گا۔ راجہ صاحب نہایت اچھے آدمی تھے فوراً کہا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔ کم از کم جماعت اسلامی کے تمام کارخانے دار، سرمایہ دار، امراء، صنعت کار، زمیندار تو فوری طور پر قاضی صاحب کے مشورے پر اپنے اپنے دائرے میں آج ہی سے عمل کر سکتے ہیں، اس کے لیے حکومت، اقتدار، انتخابات جیتنے کی کیا ضرورت ہے؟ تم نے بہت عمدہ بات کی ہمیں متوجہ کیا، میں احسان مند ہوں، تمہاری بات اوپر تک پہنچا دوں گا اور خود بھی عمل کروں گا۔

الیکشن گزر گئے اسلامک فرنٹ ہار گیا۔ جاوید غامدی صاحب بھی اسلامک فرنٹ کی شوریٰ کے رکن تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ جماعت اسلامی کے امراء، صنعت کاروں، زمینداروں، کارخانہ داروں کے یہاں مزدور، کسان کی تنخواہیں بڑھا دی گئیں یا نہیں؟ ان کو پیداوار میں حصہ دار بنا دیا گیا یا نہیں؟ مجھے نہیں معلوم! لیکن تمام اسلامی جماعتوں، اسلامی تحریکوں اور صوفیاء سے عاجزانہ استدعا ہے کہ وہ اپنے امیر، صاحب حیثیت، مرفع الحال متوسلین، مریدین، مقلدین کو بار بار ہدایت کریں کہ وہ اپنے مزدوروں، خادموں، ڈرائیوروں کی تنخواہوں میں کم از کم اتنا اضافہ ضرور کر دیں کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات زندگی پوری کر سکیں۔ کراچی میں بہت سے دین دار امراء سے ہمارے ذاتی مراسم ہیں جو اپنے مالی، ڈرائیور، باورچی کو دس بارہ ہزار روپے سے زیادہ نہیں دیتے لیکن ان کے ذاتی خرچے لاکھوں روپے ہیں۔ ہر سال یہ لاکھوں روپے بیرون ملک گھومنے پھرنے پر ضائع کرتے ہیں اور اسے “16 / rF"EäDYA°” کہتے ہیں۔ کم تنخواہ دینے کی واحد دلیل یہ ہوتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ ہے۔ ہم نے اپنے اردگرد امیر دوستوں کے گھروں میں دیکھا ہے کہ وہ رہائش کے لیے ایک کمرہ دے دیتے ہیں اور صرف دو ہزار چار ہزار روپے تنخواہ دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس رقم میں ایک شخص اپنے پانچ گھر والوں کا پیٹ کیسے بھر سکتا ہے؟ دلیل یہ ہوتی ہے کہ مارکیٹ ریٹ ہے۔ اگر زیادہ دیا تو سر پر چڑھ جائیں گے۔

۲۰۱۰ء میں پنجاب میں سیلاب آیا تو لوگ روزگار کے لیے کراچی منتقل ہو گئے۔ ایک چار رکنی خاندان کی سفارش ہم نے ایک دوست سے کی جو کروڑ پتی تھے۔ آٹھ کمرے کا گھر تھا۔ اکیلے رہتے تھے۔ انہوں نے خاندان کو کام پر رکھ لیا ایک چھوٹا سا کمرہ دیا جس میں کوئی

کھڑکی نہیں تھی صرف ایک چار پائی آسکتی تھی، اسی میں باورچی خانہ بھی تھا دو ہزار روپے معاوضہ مقرر ہوا۔ کام یہ تھا کہ گھر کی مکمل صفائی، مالی اور باورچی کا مکمل کام۔ صرف دو گھنٹے گھر سے باہر جانے کی اجازت۔ ہر وقت گھر میں رہنا۔ ہم نے عرض کیا کہ دو ہزار میں یہ کھانا کیسے کھائے گا؟ آپ کھانے کی ذمہ داری لے لیں جو کھانا آپ کے لیے پکائے باورچی اور اس کے گھر والے بھی یہ کھانا کھالیں یا کم از کم آپ راشن ڈلوادیں۔ وہ آمادہ نہ ہوئے۔ ہم نے کہا چار لوگ اس کمرے میں کیسے سوئیں گے؟ فرمایا یہ میرا مسئلہ نہیں ہے، میں نے نوکری دے دی ہے۔ ان کے گھر میں ایک گراج بنا ہوا تھا جو خالی تھا، بے کار پڑا ہوا تھا، کشادہ اور ہوادار تھا۔ ہم نے سفارش کی کہ یہ گیراج اسے دے دیں، یہ بڑا ہے، ہوادار ہے، جگہ زیادہ ہے۔ جواب ملا یہ گھر سے باہر ہے بالکل آخری حصے میں ہے اس کی نگرانی صحیح طریقے سے نہیں ہو سکے گی۔ یہ کمرہ گھر کے اندر ہے آپ جانتے نہیں یہ سرائیکی کام چور بدمعاش ہوتے ہیں۔ کئی لوگوں کو وہاں کرائے پر رکھ لیں گے، جرائم شروع کر دیں گے۔ ہم نے کہا اور جو جرائم آپ کر رہے ہیں وہ؟

سوال یہ ہے کہ محبت واخوت کا تقاضا کیا ہے؟ کیا پانچ بچوں کا باپ بارہ ہزار میں اپنے بچوں کو کراچی شہر میں کرایہ کا گھر لے کر، پیٹ بھر کر کھانا کھلا سکتا ہے؟ ہم نے اپنے علاقے میں ایسے امراء بھی دیکھے ہیں جو نہایت دین دار ہیں لیکن اپنے ملازم باورچی کو صرف دو تین ہزار روپے دیتے ہیں۔ جب ان سے پوچھتا ہوں کہ اتنے کم پیسے کیوں؟ تو جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے انہیں رہائش بھی دی ہے، بجلی پانی گیس مفت، باہر جائیں گے تو صرف کرایہ ہی آٹھ ہزار ہوگا لہٰذا اصلاً ہم ان کو گیارہ ہزار دے رہے ہیں۔ ظاہر ہے ان مذہبی دلائل کا جواب دینے کے لیے نئے 'پیغام پاکستان' کی ضرورت ہے۔ وہ کب آئے گا؟ معلوم نہیں۔

سراج الحق صاحب نے فرمایا ہے کہ جماعت اسلامی اقتدار میں آئے گی تو مزدور کو کارخانوں اور کھیت پیداوار میں حصہ دار بنائے گی۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ شریعت کا حکم کیا ہے؟ کیا یہ اجتہاد ہے؟ تفرد ہے؟ شرعی ذمہ داری ہے؟ اسلامی تاریخ میں امراء، خلفاء، سلاطین، علماء مجتہدین نے اس بارے میں کیا احکامات دیے ہیں؟ ہماری روایت کیا تھی؟ کیا فیاضی، سخاوت، انفاق، مؤدت، محبت، مواخات سب رسمیں، اقدار مر چکی ہیں؟ کہ حکومت کی ضرورت پڑ گئی وہ بھی جماعت اسلامی کی حکومت کی۔ وہ کب آئے گی پتہ نہیں، اس وقت تک

غریب کیا کریں؟ مساجد، مدارس، خانقاہوں، اور اسلامی تحریکوں کے لوگ اپنے امیر احباب پر توجہ دیں، ان کی تربیت کریں، حکومت کے انتظار میں وقت نہ گزاریں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قسم کے انقلابی فیصلوں کے لیے اقتدار کی کیا ضرورت ہے؟ جماعت اسلامی اپنے تمام کارخانہ دار حامیوں اور زمینداروں کو حکم دے کہ وہ ان لوگوں کو پیداروار میں حصہ دار بنائیں۔ ایک نمونہ اقتدار میں آنے سے پہلے دنیا کو دکھا دیا جائے۔ اسلامی تاریخ وتہذیب ضابطوں، قوانین، فیصلوں، احکامات پر نہیں کھڑی۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ جب سب مسلمان بھائی ہیں، مواخات ہے، مخلوق اللہ کا کنبہ ہے (الخلق عیال اللہ) اگر سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، تو اپنے باپ کے بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت اتنی ظالمانہ غیر منصفانہ کیوں ہے؟ اسلامی تاریخ وتہذیب میں کبھی یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا کہ میرے گھر کا خادم بھوکا رہے گا۔ اس کے بچے بھوکے رہیں گے اور مَیں پیٹ بھر کر کھاؤں گا! کسی روایتی اسلامی تہذیب میں یہ جہالت، ضلالت اور شقاوت نہیں تھی۔ علماء اور مذہبی جماعتیں اس موضوع پر خاص توجہ دیں۔

آزادی، مساوات، ترقی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کے عقیدوں نے امراء کو اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ علماء کو ان عقیدوں کے خلاف جہاں کرنا ہوگا۔ ہر شخص عیش کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے لہٰذا اس کی آمدنی اس کے اخراجات کے لیے کافی نہیں۔ Consumerism نے ہر شخص کو ہر وقت خریداری میں لگا دیا ہے لہٰذا لوگوں کی بچت ختم ہوگئی ہے۔ امیر بھی غریب ہوگئے ہیں۔ ہر ایک کو شکوہ ہے کہ خرچہ پورا نہیں ہوتا۔ امیر لوگ اگر اپنے معیارات زندگی کم کرلیں تعیّشاتِ زندگی ختم کردیں تو ان کے رشتہ داروں، غرباء، مساکین کی ضروریات زندگی پوری ہوجائیں گی۔ اسلامی تہذیب وتاریخ میں یہ کام ریاست کا نہیں عاقلہ، خاندان، قبیلے، برادری کا ہے۔ ریاست کا کام وہ انسان تیار کرنا ہے جو ہدایت یافتہ ہو، جو خوف آخرت میں گرفتار ہو۔ اسلام نے سادگی کا حکم اصلاً امیروں کو دیا ہے غریبوں کو نہیں لیکن اس میں غریبوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ تم کو تو خاص طور پر سادگی اختیار کرنا چاہیے تاکہ قرض سے محفوظ رہو۔ حیرت ہے کہ امراء سادگی کی بجائے تعیّش کو ایک مذہبی طرز زندگی کے طور پر قبول کرچکے ہیں لہٰذا وہ غرباء، خدام، کارکنوں کے معاوضوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انہیں یہ بھی

معلوم نہیں کہ یہ دنیا عیش کی نہیں مشقت کی اور آزمائش وامتحان کی جگہ ہے۔قرآن نے عیش کا لفظ صرف دوجگہ استعمال کیا ہے وہ بھی جنت کے لیے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خود ایک موقع پر فرمایا کہ 'کفار کے لیے دنیا کا عیش ہے اور ہمارے لیے آخرت کا عیش' اور حیرت ہے کہ جس پیغمبر کا یہ قول ہے اس کے امتی دنیا میں عیش کر رہے ہیں اور ان کے خدام، کارکن، ملازمین، رشتہ دار بھوکے مر رہے ہیں۔

تمام مذہبی جماعتیں Anti-consumerism تحریک چلائیں۔خراج معیشت کی ثقافت (Consumer culture) نے مذہبی امیروں کو بہت متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی انفاق کی صلاحیت کم ہوگئی ہے اور ان کے اخراجات بہت بڑھ گئے ہیں۔

بقیہ: رمضان ابتداء ہے، انتہاء نہیں!

چوتھا کام یہ کہ عموماً رمضان المبارک میں وہ تمام چیزیں جو عام حالات اور دنوں میں ہمارے لیے حلال اور جائز ہیں صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک اللہ تعالیٰ کے حکم کی پاسداری میں ہم ترک کر دیتے ہیں، لہٰذا ہمیشہ کے لیے ہمیں اس سبق کو یاد رکھنا چاہیے اور دائمی طور پر اُن تمام حرام اشیاء جیسے سود کا مال، حرام کی کمائی، غصب شدہ اشیاء وغیرہ اور ناشائستہ صفات وعادات جیسے جھوٹ، غیبت، دھوکہ، خیانت، کام چوری، گالم گلوچ، لڑائی جھگڑے اور اس جیسے دیگر بری عادات سے ہمیشہ بچنا چاہیے۔اس کے علاوہ بھی شریعت کے جتنے اوامر ونواہی ہیں چاہے وہ ہماری انفرادی زندگی میں ہوں یا اجتماعی زندگی میں، اخلاقی امور ہوں یا معاشرتی ان کی مکمل پابندی کرنی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہیے۔

پانچواں کام یہ کریں کہ جیسے رمضان المبارک میں خوب شوق وجذبہ کے ساتھ دن رات قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف رہے، اسی طرح غیر رمضان میں بھی قرآن پاک کی تلاوت سے اس رشتہ کی آبیاری کریں تاکہ یہ رشتہ کمزور ہونے کی بجائے مزید طاقتور اور مضبوط ہو۔علاوہ ازیں صرف تلاوت پر اکتفاء کرنے کی بجائے قرآن حکیم کے معانی، مفاہیم اور پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کریں تاکہ اگلے رمضان میں اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایمانی حلاوت بھی محسوس کریں۔

عالم اسلام

محمد ندیم[۱]

شام کے المیے کی صحیح تفہیم ضروری ہے

شام - ماضی، حال اور مستقبل

بلاد شام دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ یہاں پر قدیم ترین سامی اقوام اور زبانوں کے آثار دستیاب ہوئے ہیں۔ بلاد شام مسلمانوں کے لئے انتہائی اہم اور مقدس سرزمین ہے اور کیوں نہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں کئی روایات منقول ہیں۔

۱۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے دیکھا کہ میرے تکیے کے نیچے سے کتاب کا ایک بنیادی حصہ مجھ سے واپس لیا جارہا ہے، میری نظروں نے تعاقب کیا، اُدھر سے نور پھوٹ رہا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ شام میں رکھ دی گئ ہے، پس جب فتنے رونما ہوں تو ایمان شام میں ہوگا۔ (صححہ البانی فی فضائلِ الشام ودمشق)

۲۔ زید بن ثابتؓ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شام کیلئے خوشحالی ہے، ہم نے عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا رحمن کے فرشتے اس پر اپنے پر پھیلائے ہوئے ہیں۔ (ترمذی، حدیث نمبر ۲۲۱۷)

۳۔ حضرت عبداللہ بن حوالہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا؛ اے اللہ کے رسول آپ مجھے بتائیں کہ میں کس علاقے میں قیام کروں، اگر مجھے پتہ ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ساتھ لمبے عرصے تک رہیں گے تو میں آپ کی رفاقت کے علاوہ کہیں اور رہنے کو ہرگز ترجیح نہ دوں؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا؛ شام کی طرف جاؤ، شام کی طرف جاؤ، تو جب آپؐ نے دیکھا کہ مجھے شام پسند نہیں ہے تو آپ نے فرمایا؛ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ اس بارے کیا فرماتا ہے؟ پھر آپؐ نے فرمایا؛ شام میری زمینوں میں سے وہ منتخب کردہ زمین ہے جہاں میں اپنے بہترین عابدوں کو داخل کرتا ہوں۔ (رواہ ابوداؤد و احمد سندہ صحیح)

۴۔ مسکن ابنِ حوالہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛ عنقریب امر (جہاد) اس طرح ہوگا کہ تم لشکروں کے مجموعے بنو گے، ایک لشکر شام میں ہوگا، ایک یمن

[۱] پشاور، nts143043@gmail.com

میں اور ایک لشکر عراق میں، ابنِ حوالہ سے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر میں یہ صورت پاؤں تو آپ میرے لئے کسی لشکر کا انتخاب فرما دیں، آپ نے فرمایا؛ تم شام کے لشکر کو لازم پکڑنا، کیونکہ وہ اللہ کی سرزمین میں ایک پسندیدہ خطہ ہے اور وہ اپنے بندوں کو اس طرف لائے گا ہاں اگر تم وہاں نہ جاؤ تو تم یمن کا رخ کرنا اور اس کے حوضوں سے سیراب ہونا، اللہ تعالی نے شام اور اہلِ شام کی محافظت کی مجھے ضمانت دی ہے۔ (ابوداؤد ۲۴۸۳)، سلمہ بن نفیل الکندی ؓ سے نسائی کی صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ؐ نے فرمایا؛ ایمان والوں کا گھر شام ہے۔

۵۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب اہلِ شام فساد کا شکار ہو جائیں تو پھر تم میں کوئی خیر نہیں، میری امت میں سے ایک طبقہ نصرت مندر ہے گا، جو لوگ انہیں بے یار و مددگار چھوڑیں گے وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔ (ترمذی ۲۱۹۲)

اور ایک حدیث غوطہ کے بارے میں بھی سن لیجئے جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت جنگی حالات میں مسلمانوں کا ہیڈ کوارٹر قرار دیا ہے۔

۶۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: عنقریب تمہارے لئے شام فتح ہو جائے گا۔ اس میں ایک جگہ جسے "غوطہ" کہتے ہیں یہ جگہ سخت جنگوں میں مسلمانوں کا بہترین ٹھکانا ہوگی۔ (مسند احمد)

موجودہ گھمسان کی لڑائی میں شام کے شہریوں کی اجتماعی نسل کشی نے انسانیت کے تمام دعوؤں کو جھوٹ ثابت کر دیا ہے اور یہ فرعونیت اُن تمام اداروں اور تنظیموں کے کردار پر سوالیہ نشان ہے جو آئے روز انسانیت کا ڈھونگ رچاتے ہوئے اس کے تحفظ کی بلند بانگ دعوے کرتے نظر آتے ہیں۔ شام اس دنیا میں جہنم کی نظیر بن چکا ہے۔ حالات مزید سنگین ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے بعد یہ جنگ بے مہار ہو جائے گی اور جنگ بندی کے لئے کوئی ملک اپنا کردار ادا کرنے سے تہی دامن دکھائی دے گا۔ شام میں جاری اس گھمسان کی لڑائی کا مقصد کیا ہے، کیوں مہذب شہری اپنی موت کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیوں عالمی طاقتوں نے زور آزمائی کے لئے شام کی مقدس سرزمین کو منتخب کیا ہے، مختصر یہ کہ شام کا اصل قضیہ کیا ہے؟ ان سوالات کے تسلی بخش جوابات اور موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے چند امور کو خاطر میں لانا اصل قضیے کی طرف رہنمائی کا واحد ذریعہ ہے۔ شام میں مقتدر طبقہ کا تعلق کس قبیلے سے ہے؟ اقتدار تک پہنچنے کے لئے اُن کی ریشہ دوانیوں کی داستان کیا ہے اور وہ کیا چاہتا

ہے؟ برسوں سے شام میں جاری جنگ وجدل کی نوعیت کیا ہے۔اس جنگ میں کون کون سے ممالک براہ راست اور کون بالواسطہ شریک ہیں۔کون کس کا حلیف ہے اور کون کس کے مد مقابل اور مخالف ہے۔یہ ممالک اس مقدس سرزمین میں کس قسم کے مفادات کا حصول چاہتے ہیں،اُن کے عقائد ونظریات اور ایجنڈا کیا ہے۔یہی وہ امور ہیں جو عالمی طاقتوں کے شطرنج کا کھیل سمجھنے میں مدد فراہم کرینگے۔

پہلی عالمی جنگ عظیم تک بلاد شام ایک وسیع وعریض علاقہ پر مشتمل تھا لیکن جب خلاف اسلامیہ کمزور پڑی مسلمان ملکوں پر یہود ونصاریٰ یا ان کے کاسہ لیس حکمرانوں کو مسلط کیا گیا تو انگریزوں اور اہل فرانس کی مکاری سے بلاد شام کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کردیا گیا اور موجودہ شام 1920ء کو دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا لیکن 1946ء تک اس پر فرانس کا قبضہ برقرار رہا چونکہ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کمزور پڑ گیا ،جب اسے محسوس ہوا کہ وہ شام پر مزید اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو فرانس نے 1944ء میں کیے جانے والے معاہدۂ آزادی کو دوبارہ تسلیم کرلیا اور 15 اپریل 1946ء کو فرانسیسی اور برطانوی افواج شام سے کوچ کر گئیں، بالآخر 17 اپریل 1946ء کو شام نے آزادی کا اعلان کردیا۔تاریخ میں جس خطے کو "بلادِشام" کہا گیا ہے، وہ موجودہ چار ملکوں پر مشتمل علاقہ ہے۔

۱۔ حالیہ شام (دارالحکومت دمشق) جہاں روافض کا خونیں پنجہ مسلم جسم کو نوچ رہا ہے۔

۲۔ فلسطین (دارالحکومت بیت المقدس) جہاں پون صدی سے یہود قابض ہیں۔

۳۔ لبنان (دارالحکومت لبنان) جہاں مسلمانوں کو اقلیت میں رکھا گیا ہے اور طریقے طریقے سے ان کا استحصال کیا جاتا ہے۔

۴۔ اردن (دارالحکومت عمان) جہاں برطانوی استعمار کے پرانے ایجنٹ اور نمک خوار مسلط ہیں اور صیہونیوں سے یاری کا حق ادا کرتے ہیں۔

بلاد شام کو تقسیم کرنے کے بعد باقاعدہ پلاننگ کے تحت ان چاروں ملکوں سے اسلامی اقدار اور آثار مٹانے کی کوشش کی گئی اور اس کے لئے فرانسیسیوں نے اپنے باعتماد اور تاریخی اتحادی 'روافض' کی خدمات حاصل کیں لیکن اس بار فرق صرف اتنا تھا کہ روافض کے بھی بد ترین فرقے ''نصیریہ اور علویہ'' کو چنا گیا۔مسلمان اور شیعہ حضرات دونوں ان فرقوں کو اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔خلافت عثمانیہ کے زمانے تک یہ فرقے خاموش رہے لیکن سقوطِ خلافت

کے فوراً بعد ہی انہوں نے مخصوص ایجنڈے پر کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ شام کے ساحلی پہاڑی کے ساتھ واقع ایک علاقہ لاتیکا میں مقیم تھے اور اُس وقت یہ علاقہ قسطنطینی ریاست کے زیر اہتمام تھا۔ 1936ء جب میں فرانسیسی حکمرانوں نے اس علاقہ کو شام کے ساتھ الحاق کرنا چاہا تو فرانس میں قائم شدہ پاپولر فرنٹ کے سربراہ کو انہوں نے میمورنڈم بھیجا، جس کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱۔علوی لوگ جنہوں نے کئی سالوں تک بڑی غیرت اور قربانیوں کے ساتھ اپنی آزادی کی حفاظت کی ہے، دوسرے سنی مسلمانوں سے مختلف ہیں۔

۲۔علوی، مسلم شام کے ساتھ اپنے الحاق کا انکار کرتے ہیں کیونکہ شام کا سرکاری دین اسلام ہے اور اسلام کے مطابق علوی کافر ہیں۔

۳۔ہم اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ دمشق کے مسلمانوں نے اپنے درمیان رہنے والے یہودیوں کو ایک دستاویز پر دستخط پر مجبور کیا کہ وہ فلسطین میں رہنے والے اپنے بدقسمت یہودی بھائیوں کو مدد نہیں بھیجیں گے۔ یہودیوں کی فلسطین میں قابل رحم حالت اسلام میں موجود اس زیادتی کی واضح مثال ہے جو کہ وہ غیر مسلموں سے روا رکھتا ہے۔ حالانکہ ان اچھے یہودیوں نے عربوں کے اندر تمدن اور امن کی آبیاری کی، سونا بانٹا اور بغیر کسی کا مال لوٹے اور نقصان پہنچائے فلسطین میں خوشحالی لے آئے۔ پھر بھی مسلمانوں نے ان کے ساتھ اعلان جنگ کیا اور سرکار برطانیہ کی فلسطین میں موجودگی اور فرانس کی شام میں موجودگی کے باوجود ان کا قتل عام کرنے سے کبھی نہ ہچکچائے۔ چنانچہ رائے عامہ کا احترام نہ کرتے ہوئے اگر مسلم شام کو مسلم فلسطین کے ساتھ اکٹھا کر دیا گیا تو ان یہودیوں اور دوسری اقلیتوں کا بدترین انجام ہوگا۔

اس میمورنڈم میں اسلام دشمنی اور یہود سے دوستی ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے اور اس پر دستخط کرنے والوں میں سے ایک نام ''سلمان الاسد'' کا ہے جو کہ کلبیہ قبیلے کا سردار تھا۔ یہی ''سلمان الاسد'' موجودہ صدر بشار الاسد کا دادا اور حافظ الاسد کا باپ تھا۔ شام کے فرانسیسی حکمرانوں نے جن کو اصل خطرہ سنی اسلام سے تھا ان علویوں کی ایک علیحدہ فوج تشکیل دی اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کیا۔ یہی فوج فرانسیسی سامراج سے آزادی کے بعد شامی نیشنل آرمی کہلائی۔ 1946ء میں علوی خاندان کے ہونہار فرزند نے صرف سولہ سال کی عمر میں

بعث پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی ۔ یہ نوجوان کوئی اور نہیں حافظ الاسد ہی تھا جس نے سیاست میں شمولیت کے ساتھ ساتھ نیشنل آرمی بھی جوائن کر لی تھی ۔ بعث پارٹی نے جب 1958ء میں ناصر کی تعلیمات سے متاثر ہو کر شام کا مصر کے ساتھ الحاق کرنے کا ارادہ کر لیا تو پارٹی میں موجود علویوں نے 1963ء کو ایک علوی ''صالح حدید'' کی قیادت میں بغاوت کر دی۔ حافظ الاسد جو کہ ایک جنگجو پائلٹ تھا کو ایک ایئر فورس کمانڈر بنا دیا گیا۔ فوج کے تقریباً سات سو عہدوں پر پرانے افسروں کو نکال کر نئے نُصیری کمانڈر تعینات کئے گئے ۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں شام کی شکست کے بعد حافظ الاسد جو کہ اب وزیر دفاع بن چکا تھا نے شامی حکومت پر اسرائیل کے ساتھ خفیہ مراسم رکھنے کا الزام لگایا اور ایک محلاتی سازش کے تحت 11 مارچ 1971ء کو حافظ الاسد اقتدار پر قابض ہو گیا۔ حافظ الاسد کے صدر بنتے ہی شامی قانون میں ایک تبدیلی کی گئی۔ شامی قانون کے مطابق صدر بننے کیلئے مسلمان کا 'سنی مسلمان' ہونا ضروری تھا جبکہ حافظ الاسد نے اس شق کو تبدیل کر کے حکمران کا صرف مسلمان ہونا کافی قرار دے دیا۔ 1973ء میں لبنان کے اثنا عشری رافضی امام موسیٰ الصدر نے ایک فتویٰ جاری کیا جس کہ مطابق نُصیریوں کو باقاعدہ شیعوں فرقے کا ایک گروپ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ فتویٰ مذہبی سے زیادہ سیاسی تھا جس کے پیچھے عرب عالم میں رافضی اقتدار کو فروغ دینا تھا اور یوں شیعہ حضرات کا شام پر گرفت مزید مضبوط ہوا۔

شامی مسلمان ایک تو مذہبی حمیت کی وجہ سے کسی نُصیری کو اپنا حکمران ماننے پر تیار نہ تھے دوسری طرف وہ سمجھتے تھے کہ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ میں نُصیری حکومت نے واقع اسرائیل کے ساتھ ایک خفیہ معاہدہ کیا تھا جس کے افشا ہونے پر حافظ الاسد کو برطرف کرنے کے مطالبات کا آغاز ہوا۔ 1980ء میں حافظ الاسد کے خون آشام نُصیری دستوں نے حماۃ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا۔ صرف جیلوں میں موجود 1200 اخوان المسلمین کے قیدیوں کو بغیر مقدمہ چلائے مار دیا گیا اور حماۃ کے اوپر ٹینک چڑھا دیئے گئے۔ سنی جو کہ شامی آبادی کا تقریباً 70 فیصد ہیں طرح طرح کے مشکلات کا شکار ہیں۔ خاص طور پر وہ علاقے جو کہ 1980ء کے انقلاب میں بڑے سرگرم تھے جیسے کہ حماۃ، درہ، حمص، یہی وجہ ہے کہ موجودہ انقلاب بھی جو کہ مارچ 2011 سے شروع ہوا انہی شہروں سے شروع ہوا۔

سال 2011ء میں لیبیا کے صدر معمر قذافی کی ڈکٹیٹر شپ اپنے انجام کو پہنچی اور سال 2014ء میں شہریوں کی انتھک جہد وجہد سے تیونس کے زین العابدین کی 24 سالہ کی

بادشاہت کا خاتمہ ہوا۔ شام کے شہریوں نے محسوس کیا کہ عوام کی طاقت حکمرانوں کو اپنے مطالبات منوانے کے لئے مجبور کر سکتی ہے یا پھر اقتدار سے فارغ کر سکتی ہے تو شامی عوام بھی اپنے مطالبات لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ صرف حکومت میں سیاسی اصلاحات چاہتے تھے تاہم پندرہ مارچ کو حکومتی فورسز نے درعا میں نہتے عوام پر فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں چار شہری ہلاک ہوئے۔ اسی دن درعا میں سکول کے طلبہ نے بشار الاسد کو مخاطب کر کے دیوار پر اس نعرے کی وال چاکنگ کی''جائک الدور یا دکتور'' کہ اب (قذافی) کی طرح تمہاری باری ہے۔ 15 مارچ 2011 سے 28 مارچ 2011 تک حکومتی کریک ڈاؤن کے نتیجے میں 60 مظاہرین ہلاک ہوئے اور بشار الاسد نے عالمی برادری کے مطالبات مسترد کرتے ہوئے مظاہرین کے خلاف کارروائی جاری رکھی۔ 19 جولائی 2012 میں حکومتی کریک ڈاؤن کا سلسلہ حلب تک پھیل گیا۔ وہاں مظاہرین اور حکومتی دستوں میں لڑائی شروع ہوئی تو یہ تاریخی شہر تباہی سے دو چار ہونا شروع ہو گیا۔ تب درعا، حمص، ادلب اور دمشق کے نواح میں جاری خانہ جنگی مزید شدت اختیار کر گئی۔ اسی دوران حکومت مخالف مظاہرین کی تحریک مکمل باغی فورس میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ دسمبر 2012ء میں برطانیہ، امریکا، فرانس، ترکی اور خلیجی ممالک نے باغی اپوزیشن کو شامی عوام کی قانونی نمائندہ تسلیم کر لیا اور اُن سے تعاون بھی شروع کر دی۔ اس وقت بھی شامی صدر نے عالمی مطالبات مسترد کر دیے اور یوں پر امن احتجاج اور چند مطالبات کی کوکھ سے اس جنگ کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے چند ماہ میں پورے شام کا احاطہ کر لیا۔ ہر جگہ بشارت الاسد کے خلاف مظاہرے ہوئے۔ ان مظاہروں کو کچلنا بشار الاسد کے لئے اتنا آسان نہ تھا لیکن ایران نے حزب اللہ، پاسداران انقلاب اور فاطمیوں کی بدولت بشار الاسد کے لیے ان مظاہروں کو کچلنا آسان بنا دیا۔ آج اس جنگ میں ایران، امریکہ، روس اور ترکی براہ راست شریک ہیں جبکہ سعودی عرب اور قطر بالواسطہ تعاون کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جبکہ اسرائیل کے بھی مفادات وابستہ ہیں۔ ان تمام کے مفادات اور نظریات مختلف ہیں یہی وجہ ہے کہ شام میں اس وقت جنگ کی نوعیت بھی مختلف ہے۔ علوی اور نصری سنی مسلمانوں کو چن چن کر مار رہے ہیں اور اپنی انتقامی آگ بجھانے کی کوشش میں ہیں جبکہ دیگر ممالک اپنے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر خون کی ہولی کھیل رہے ہیں۔

شام کی سرزمین پر اب دو عالمی طاقتیں آمنے سامنے ہیں۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہ دہشت گرد تنظیم داعش کے خلاف لڑ رہے ہیں مگر حقیقت میں یہ جنگ اپنے اپنے مفادات کے

تحفظ کے لئے ہے۔ امریکہ اور روس کے شام میں اپنے اپنے مفادات ہیں جن کے لئے وہ یہاں دخیل ہیں اور شام کو تباہ کررہے ہیں۔ حالانکہ یہ نئی جنگ داعش کے خلاف جنگ کے نام پر شروع ہوئی ہے۔ اب تک یہاں امریکہ اور اس کی ہمنوا طاقتیں سرگرم تھیں مگر اب اس کے بیچ جس طرح روس نے انٹری لی ہے وہ امریکہ کے لئے دردسر سے کم نہیں ہے۔ امریکہ کا کہنا ہے کہ وہ داعش جیسی عالمی دہشت گرد تنظیم کے خلاف جنگ لڑنے کے لئے شام کے میدان میں کھود پڑا ہے مگر حقیقت میں وہ انھیں تحفظ فراہم کررہا ہے۔ ورنہ کیا سبب ہے کہ ایک مدت سے لڑنے کے دعوے کے باوجود امریکہ اور مغربی ممالک کو کامیابی نہیں ملی اور چند دن میں روس نے داعش کا پورا سسٹم تباہ کردیا۔ امریکہ ایک طرف داعش کی مدد کررہا ہے تو دوسری طرف سنی مسلمانوں کو ہتھیار اور فنڈز فراہم کررہا ہے تاکہ بشارالاسد کی حکومت کو ختم کیا جاسکے اور کسی امریکہ نواز اور اسرائیل نواز ڈکٹیٹر کو لایا جاسکے جو امریکہ کو دیرالزور میں تیل کے کنوؤں تک رسائی کو یقینی بنائے اور وسطی ایشیاء میں روس کی بڑھتی ہوئی قوت کا سدباب کرے۔ امریکا جیسے اسلام دشمن نے بشارالاسد کے خلاف بیان اور میزائل داغے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب سے بڑی استعماری طاقت کے دل میں مسلمانوں کا درد جاگ اٹھا ہے۔ جس طاقت نے مسلمانوں کی ایک بہن عافیہ صدیقی کو 86 سال کی سزا دے دی اور مسلمانوں کے جذبات کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور جس کی پشت پناہی سے فلسطینی مسلمانوں کی ہر شب شبِ غم اور ہر دن یوم حشر ہے، اس کے بارے میں کوئی سمجھ دار شخص یہ توقع نہیں کرسکتا کہ اسے شامی مسلمانوں سے کوئی ہمدردی ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ اسرائیل کے دیئے ہوئے ایجنڈے کے مطابق شام کو مزید چار ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کی کوشش میں مصروف عمل ہے تاکہ چاروں ٹکڑے پانی، تیل اور زراعت کیلئے آپس میں لڑتے رہیں گے اور اسرائیل کے خلاف مزاحمت کی جرأت نہ کرسکیں۔ اس کے لئے وہ ایک طرف بشارالاسد کے خلاف سنی مسلمانوں کی مالی اور ہتھیاروں کے ذریعے مدد کررہا ہے تو دوسری طرف داعش کو انہیں سنی مسلمانوں کی سپاری دے رکھی ہے۔ اس خانہ جنگی کے نتیجے میں اس وقت شام دنیا کے ان ممالک میں شامل ہوچکا ہے جہاں مردوں کا تناسب سب سے کم رہ گیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق وہاں نوجوانوں کے جنگ کی نذر ہونے اور بوڑھوں کے امراض اور مصائب سے فوت ہونے کے بعد ستر فیصد سے زیادہ محض خواتین رہ گئی ہیں۔ وہ شہر جو خطرے کی زد سے باہر ہیں، وہاں بھی لڑکیوں کے لیے

رشتہ ملنا، دنیا کا سب سے مشکل کام بن گیا ہے۔ جو بے چارے جنگ زدہ علاقوں یا مہاجر کیمپوں میں ہیں، ان کے مسائل کا اندازہ ہمیں اپنے گھروں میں بیٹھ کر نہیں ہوسکتا۔ اتنا جان لینا کافی ہے کہ صاف پانی کا ایک گلاس مل جانا، ان کے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

روس نے سال 2013 سے اس جنگ میں حصہ لیا ہوا ہے۔ اس جنگ میں کودنے سے روس کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ وہ شام کو بچانے کے لئے اب کیوں آگے آیا، پہلے کیوں نہیں آیا؟ اس قسم کے سوال اٹھنے فطری ہیں۔ روس نے دہشت گرد تو مار گرائے لیکن انتہائی اہم سوال زندہ کر دیئے۔ اس کا جواب صاف ہے۔ یہ جنگ مفادات کی جنگ ہے۔ نہ تو امریکہ مسلمانوں کا حامی ہے اور نہ ہی روس کو ان کے ساتھ کسی قسم کی محبت ہے۔ اصل کھیل بشارالاسد کو بچانے اور انھیں ہٹانے کا ہے۔ امریکہ نے دہشت گردوں کا نیٹ ورک اسد کے خلاف کھڑا کیا تھا تاکہ وہ اسد کو کمزور کریں اور امریکہ یہاں اپنے کسی کٹھ پتلی کو بٹھا سکے، جب کہ روس کے مفادات اسد سے وابستہ ہیں لہٰذا وہ کسی بھی حال میں انھیں بچانا چاہتا ہے۔ روس کی معیشت کا تقریباً چالیس فیصد توانائی کی برآمد سے آتا ہے۔ اس میں بھی قدرتی گیس ایک بہت بڑا ذریعہ ہے۔ امریکہ اور اسرائیل نہیں چاہتے کہ گیس کے لئے یورپ کو روس پر انحصار کرنا پڑے۔ روسی صدر ولادیمیر پوتن کسی بھی حالت میں امریکہ کے اس منشا کو کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔ یہی سبب ہے کہ دونوں ممالک نے اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لئے شام کو محاذ کے طور پر منتخب کیا ہے۔ اس کے علاوہ روس کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ وہ اسلحے کی عالمی منڈی میں اپنا مقام بنائے. اس وقت 85 ارب ڈالر سالانہ کی اس منڈی میں روس کا حصہ پانچ فیصد بھی نہیں بنتا ہے. روس نے دوسری عالمی جنگ کی تقریبات کے موقعہ پر 'کو' بینکا '' نامی شہر میں جدید ترین روسی ہتھیاروں کی نمائش کی تھی۔ روس کے دارالحکومت ماسکو کے مضافاتی شہر میں منعقد ہونے والی اس بڑی عسکری نمائش میں ٹینک، توپیں، جنگی ہیلی کاپٹر، ریڈار سمیت دیگر جدید اسلحہ نمائش کے لیے رکھا گیا تھا. لیکن خریدار روسی اسلحے کے موثر ہونے کے بارے میں شکوک شبہات کا شکار تھے۔ یوں یہ نمائش بھی روسی اسلحے کے نئے خریدار تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی. ماہرین کا کہنا ہے کہ سویت دور میں افغانستان، افریقہ اور مشرقی یورپ میں سوویت اسلحے کی ناکامی کا بھوت روسی اسلحے سے چمٹا ہوا. اس بار روس شام میں اس

امید کے ساتھ آیا ہے کہ مغربی اسلحے کی ناکامی کے بعد روس اگر اس جنگ میں بشار کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تو روسی اسلحے کی فتح ہو گی جس ے بعد بہت سے نئے گاہک مل جائیں گے. یہی وجہ ہے کہ روس اس جنگ میں اپنا ہر طرح کا اسلحہ استعمال کر رہا ہے.شام میں زمینی اور فضائیہ کی موجودگی کے باوجود اُس نے بحرہ خزر سے مہنگے ترین کروز میزائیل داغے ہیں۔لیکن زمینی حقائق خواہشات سے مختلف ہوتے دکھائی دے رہے ہیں.شامی مزاحمت کاروں نے پہلے ہی معرکے میں جس طرح روسی اسلحے کو شکست فاش دی ہے اور جس طرح روسی ٹینک تباہ ہوئے ہیں یقینا اس کے بعد روسی پالیسی ساز اپنے فیصلے پر پچھتا رہے ہوں گے۔

شام میں روسی مداخلت کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شامی اور روسی سرحد کے درمیان پانچ سو کلومیٹر کا فاصلہ ہے،اگر شام میں امریکی کاسہ لیس اور ڈکٹیٹر اقتدار میں آتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ چیچنیا میں روس کے خلاف برسرِ پیکار مجاہدین کی مزاحمتی تحریک کو وسائل مہیا کئے جا سکیں تا کہ روس کی عالمی طاقت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔

ایران شام میں بشار الاسد کا حمایتی ہے اسی لئے لبنان کے اشارے پر پاسداران انقلاب اور حزب اللہ جیسی تنظیموں کے ذریعے بشار الاسد کے ساتھ مل کر سنی تحریک ختم کرنے کے درپے ہیں۔ایران ایک طرف تو مسلکی رشتے کی بنیاد پر بشار الاسد کی مدد کر رہا ہے تو دوسری طرف سنی مسلمانوں سے ازلی دشمن اور ازلی اسلام دشمن یعنی یہودیوں سے گہری دوستی کی بنیاد پر اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔شہادت کے طور پر اسرائیل کی حیفہ یونیورسٹی کے ماہر لسانیات'' جان ماہل'' کا اعتراف کافی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ''علویوں کے مذہبی عقائد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ یہودی حامی اور سنی دشمن ہیں اور تو اور اسرائیل کے نقطہ نظر سے بھی یہ ان کے لئے بہتر ہے کہ شام میں نُصیری برسر اقتدار رہیں۔اگر شام میں سنی اقتدار میں آتے ہیں تو کسی بھی وسیع پیمانے پر فلسطین اور اسرائیل کا جھگڑا ایک جذباتی ردعمل کو جنم دے گا اور شام کو نتائج کی پرواہ کئے بغیر اسرائیل کے ساتھ ایک بین الاقوامی جنگ میں کھینچ لائے گا۔

سعودی عرب اور قطر ایران دشمنی کی وجہ سے سنی باغیوں کی صرف مالی تعاون کر رہے ہیں۔سعودی عرب کا شاہی خاندان کبھی یہ نہیں چاہتا کہ بشار الاسد کی حکومت کا خاتمہ ہو اور خطے میں جمہوریت آئے یہی وجہ ہے کہ اخوان المسلمین کی حکومت ختم کرنے کے لئے سعودی عرب

اور قطر نے سب سے زیادہ زور لگایا۔انھیں ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہا ہے کہ کہیں ان کے ملک میں بھی عوام جمہوری حقوق کا مطالبہ نہ شروع کردیں اور امریکہ کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ خلیج ممالک میں جمہوریت نہ آئے کیونکہ عوام کا رویہ امریکہ کی حمایت میں نہیں جب کہ حکمراں امریکہ کے پٹھو ہیں اور اسرائیل بھی نہیں چاہتا ہے کہ کوئی بھی عرب ملک اتنا مضبوط ہو کہ کسی بھی وقت اسرائیل کے لئے خطرہ بن سکے۔

ڈی ڈبلیو کی ایک رپورٹ کے مطابق شام میں اب تک 3 لاکھ لوگ شہید اور 18 لاکھ لوگ بے گھر کئے جاچکے ہیں جبکہ گذشتہ ہفتے صدر بشارالاسد کی فوجیں روس اور ایران کی مدد سے غوطہ شرقیہ نامی علاقے پر لگاتار زمینی اور فضائی حملے کررہی ہیں۔پورا علاقہ ملکی فضائیہ اور زمینی دستوں کے محاصرے میں ہے، ان حملوں میں اب تک پانچ سو شہری ہلاک ہوچکے ہیں، ان میں ڈیڑھ سو کے قریب معصوم بچے بھی شامل ہیں۔پورا ملک کھنڈرات میں تبدیل ہوچکا ہے،نصف کے قریب آبادی ترک وطن کرچکی ہے۔ہزاروں افراد محفوظ مقامات تک پہنچنے کے لئے سمندروں میں سفر کرتے ہوئے غرقاب ہوچکے ہیں۔قرارداد کی منظوری کے باوجود فضائی بمباری کا سلسلہ جاری ہے، یہ اندیشہ ظاہر کیا جارہا ہے کہ بشار کی فوجیں جن کی پشت پر طاقت ور روس ہے کسی بھی قیمت پر جنگ بندی کے فیصلے کا احترام نہیں کریں گی اور ان کی طرف سے ''باغیوں'' اور ''دہشت گردوں'' کی سرکوبی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ بین الاقوامی برادری شام کی ظالم اور سفاک حکومت کو ان مظالم سے باز رکھنے میں پوری طرح ناکام ہے، اگرچہ زبانی مذمت کا سلسلہ جاری ہے، مگر عملی طور پر کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا جارہا ہے۔تباہی اور بربادی کا یہ سلسلہ کبھی ترقی نہ کرتا اگر بڑی طاقتیں اپنی جنگ جو فطرت کی تسکین کے لئے اور اپنے ہتھیاروں کو ٹھکانے لگانے کی خاطر اس خطے کو جنگ کے میدان میں تبدیل نہ کرتیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ بشارالاسد ایران اور روس کے ساتھ مل کر سنی آبادی کو نیست ونابود کرنا چاہتا ہے، دوسری طرف کچھ مسلم ممالک ہیں جو امریکہ کی قیادت میں سنیوں کا کمزور دفاع کررہے ہیں، بہ ظاہر شام کی سرزمین پر امریکہ اور روس دونوں ایک دوسرے سے لڑرہے ہیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں اس ملک کو تباہ وبرباد کرنے کے درپے ہیں، بین الاقوامی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں روس اور ایران کامیابی کے ہدف تک پہنچنے والے

ہیں، جب کہ امریکہ،سعودی عرب اور ترکی اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہیں،اس صورت حال پر نظر رکھنے والے مبصرین کا کہنا ہے کہ شام کی اس جنگ میں روس اور امریکہ حریف نہیں حلیف ہیں،جن کا واحد مقصد بشارالاسد کے اقتدار کو مستحکم کرنا اور سنی مسلمانوں کا اس خطے سے صفایا کرنا ہے، دونوں نے داعش اور دولت اسلامیہ کا ہوا کھڑا کررکھا ہے جن کا کوئی زمینی وجود نہیں ہے، امریکہ اور روس دونوں فضائی حملے کررہے ہیں، بل کہ روس کے متعلق تو یہ بھی اطلاعات ہیں کہ روس نے ان حملوں میں کیمائی ہتھیار بھی استعمال کئے ہیں،شام کی سرزمین ان دونوں عالمی طاقتوں کے لئے میدان جنگ بنی ہوئی ہے،نقصان ملک کا ہورہا ہے ملک کے معصوم عوام ہلاک ہورہے ہیں، ان کے مکانات، اسکول،ہسپتال،عبادت گاہیں مسمار ہورہی ہیں۔شامی مسلمان جن کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ان ملکوں کے سربراہان کی مجرمانہ خاموشی ایک سوالیہ نشان پیدا کرتی ہے۔دوسری طرف عرب ممالک کی خاموشی بھی بہت وحشت ناک ہے جو ذاتی مسئلہ پر تو ساری دنیا میں اپنے سفارتی مشنز کو متحرک کردیتے ہیں اور اسے عالم اسلام کا مسئلہ بنادیا جاتا ہے اور ایک دوسرے ملک سے ٹکر لینے کی بات کی جاتی ہے لیکن انبیاء کرام کی سرزمین شام اور حلب کے معاملے میں ان ممالک کے سربراہان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

درحقیقت اس تمام تر سازش کے پیچھے یہودیوں اور اسرائیل کا ہاتھ ہے۔گریٹر اسرائیل کے قیام کے لئے مشرق وسطی کی ریاستوں کی توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہے۔عراق اور لیبیا کے بعد اب شام اور یمن میں جنگ وجدل کا بازار گرم ہے۔لیکن المیہ ہے کہ اس عمل میں مسلمانوں کو ہی استعمال کیا جارہا ہے۔اس کو مسلمان حکمرانوں کی عاقبت نااندیشی کہیئے یا اقتدار کی لالچ اور ہوس کہ وہ صیہونی آلہ کار بن گئے ہیں۔اس وقت نہ کوئی طاقتور غیر ملکی مداخلت اور نہ ہی کوئی سیاسی مذاکرات اس جنگ کو اختتام پذیر کرسکتے ہیں بلکہ ایک شدید خطرہ یہ ہے کہ ایک نہایت ہی خطرناک قسم کی پراکسی جنگ چھڑ سکتی ہے جس میں امریکہ اور سعودی عرب ایک طرف اور روس اور ایران ان کے مقابل کھڑے ہوں گے۔کاش ! کہ مسلم ممالک کے سربراہان اس سنگین قضیے کو امریکا اور روس کی صوابدید پر نہ چھوڑیں۔انہیں شام، افغانستان اور کشمیر سمیت اپنے تمام لاینحل مسائل کو حل کرنے کے لیے عالمی طاقتوں کی کاسہ لیسی ترک کرکے ایک صف میں کھڑے ہونا ہوگا، ورنہ تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔

دریچے

نقیبِ سحر

پڑھتا جا شرماتا جا

۱۔ چوہدری صاحب کا چائے کی پتی کا بڑا وسیع کاروبار ہے۔تقریباً ہر معروف برانڈ کی چائے کے ڈبے ان کے سٹاک میں موجود ہوتے ہیں اور حسب طلب مہیا کر دیے جاتے ہیں۔ اُن کی پتی سے پینے والی چائے کا رنگ بڑا نکھرا ہوتا ہے کیونکہ وہ پلاسٹک کی مصنوعی پتی کو چائے کے ملتے جلتے رنگ سے رنگنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کے ملازمین بھی بڑے خلوص اور دیانتداری سے لپٹن، ٹپال دانے دار اور دیگر برانڈز کے ڈبوں میں نہایت مہارت سے پیک کرتے ہیں۔ پچھلے سال چوہدری صاحب عمرے پر گئے ہوئے تھے کہ کسی ناہنجار کی شکایت پر ان کے پیکنگ ہاؤس پر فوڈ اتھارٹی والوں کا چھاپہ پڑا۔ ملازم دھر لیے گئے اور سارا سٹاک قبضے میں لے لیا گیا لیکن جب افسران بالا کو چوہدری صاحب کے تقوے، خدا ترسی اور ہر سال حج عمرے کرنے کا علم ہوا تو انہوں نے 'ثواب' کی خاطر مٹھی گرم کرا کر سب کچھ درگزر کر دیا جس پر چوہدری صاحب جلال میں آ کر نعرہ زن ہوئے کہ 'یہ سب تیرا کرم ہے' آقا' کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے۔' یہاں 'آقا' سے ان کی مراد قائم اعظم کی تصویر والا پانچ ہزار کا نوٹ ہے کہ جس کا چہرہ کرانے سے سب مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔

۲۔ حاجی صاحب بہت نیک آدمی ہیں۔ ہر سال میلاد کے موقع پر درجنوں دیگیں پکوا کر غریبوں میں بانٹتے ہیں۔ جمعہ کے روز نہا دھو کر تازہ دُھلے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر سب سے پہلے پہلی صف میں خضوع وخشوع سے آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔خطیب صاحب کی تقریر دلپذیر پر سر دھنتے اور آنسو بہاتے ہیں۔ ہر مہینے مدرسے کے بچوں کی خاطر مولوی صاحب صاحب کو ہزاروں روپے نذر کرتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ ہزاروں روپے بچوں تک شاذ ونادر ہی پہنچتے ہیں۔ حاجی صاحب کا کھل بنولے کا کاروبار ہے۔کھل بنولے کے اس کاروبار میں ملاوٹ کے دھندے سے کافی منافع ہوتا ہے۔حاجی صاحب ملاوٹ کے گناہ سے ہر وقت توبہ تائب ہوتے رہتے ہیں۔مولانا صاحب نے حاجی صاحب کو اللہ کے غفور الرحیم ہونے کا اتنا یقین دلا رکھا ہے کہ وہ دھڑلے سے ملاوٹ کا گناہ کرتے ہیں اور پھر رو رو کر اپنے اللہ سے

گناہوں کی معافی کی درخواست کرتے ہیں۔تصوراُن کا یہ ہے کہ ملاوٹ کا گناہ تو بلاشبہ بڑا ہے لیکن گناہ کرنے کے بعد توبہ واستغفار کا درجہ بھی کوئی کم نہیں ہے۔

۳۔ رانا صاحب ایک دینی سیاسی جماعت کے رکن ہیں جس کا منشور نظام مصطفیٰ کے گرد گھومتا ہے۔رانا صاحب اپنے دنیاوی کام کاج میں ہروقت مصروف پائے جاتے ہیں لیکن ان مصروفیات میں نظامِ مصطفیٰ قائم کرنے کی تڑپ سے ہروقت سرشار رہتے ہیں۔نظامِ مصطفیٰ کی منزل ہر لمحہ دور سے دور ہونے کے باوجود رانا صاحب اس بات پر مطمئن رہتے ہیں کہ ان کا کام صمیم قلب سے نظامِ مصطفیٰ کے لیے ہروقت تڑپتے رہنا ہے۔باقی اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جب چاہے گا نظامِ مصطفیٰ اس ملک میں قائم ہوجائے گا۔انسان کا کام خواہش کرنا ہے،خواہش کی تکمیل اللہ کی مشیت سے مشروط ہے۔

۴۔ اللہ دتہ ایک غریب دیہاتی گھرانے میں پیدا ہوا۔باپ بچپن میں ہی فوت ہوگیا، والدہ غریب اور بے سہارا تھی۔ بیٹے کو ایک دینی مدرسہ میں ڈال گئی۔اللہ دتہ نے قرآن حفظ کیا اور ہوتے ہوتے پندرہ سالوں میں شہادۃ العالمیہ کی سند حاصل کرلی۔دینی تعلیم کے دوران اللہ دتہ سے مولانا اللہ دتہ بننے تک مصائب،آزمائشوں اور امتحانوں کا ایک سلسلہ تھا جس نے رنج وغم ، غصے اور انتقام کے جذبات کا ایک تلاطم اللہ دتہ کے اندر پیدا کیا لیکن اللہ نے اللہ دتہ کو غربت اور بے بسی کے ساتھ ذہانت بھی وافر مقدار میں عطا کی تھی جس کی وجہ سے اُس نے جذبات کو قابو میں رکھا۔عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لیے اُس نے اپنے آبائی گاؤں سے کافی دور ایک علاقہ تلاش کیا جہاں آبادی تو تھی لیکن کوئی دینی مدرسہ نہیں تھا۔مخیر لوگوں سے کچھ زمین لی، اینٹوں سے حد بندی کی، درود وسلام کے سلسلہ کے ساتھ مسجد اور مدرسہ کی تعمیر شروع کردی۔مقامی لوگوں نے بھی اور دُور دراز کے لوگوں نے بھی اس نیک کام میں مدد کی اور چند ہی سالوں میں ایک شاندار مسجد اور ایک معقول مدرسہ وجود میں آگیا۔اللہ دتہ کو اللہ نے ذہانت کے ساتھ طاقت لسانی بھی عطا کی تھی۔جلد ہی وہ مولانا اللہ دتہ سے اعلیٰ حضرت مولانا اللہ دتہ عاطف کیلانی بن گیا۔دُور دراز تک محافل میلاد میں بلایا جانے لگا۔دینی بیک گراؤنڈ اگرچہ دیوبندی تھی لیکن مقامی ماحول اور آگے بڑھنے کی امنگ نے بریلوی سکہ چلانے پر مجبور کردیا۔ تحریک لبیک یارسول اللہ قائم ہوئی تو لپک کر اس میں شمولیت اختیار کرلی۔اب ماشاء اللہ دینی

حیثیت بھی ہے اور سیاسی حیثیت بھی۔ مقامی ایم این اے اور ایم پی اے حضرت مولانا عاطف کیلانی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں لیکن منصوبہ ساز حلقے حضرت مولانا کو بہ نفس نفیس آنے والے الیکشن میں کھڑا ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ خیال یہ ہے کہ خود کامیاب نہ بھی ہو سکے تو بعض دیگر ناپسندیدہ حلقوں کا راستہ روکنے میں تو کام آئیں گے۔

۵۔ راجہ جنگ کے راجہ سبطین خاں بڑی قسمت والے آدمی ہیں۔ میٹرک پاس کر کے کراچی چلے گئے۔ وہاں قسمت نے یاوری کی اور پولیس میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ بندہ جی دار بھی تھا اور ذہین بھی، جلد مؤثر قوتوں کے ساتھ رابطے میں آ گیا۔ خود بھی بھتہ خوری کرتا اور بھتہ خوروں کی سرپرستی بھی کرتا۔ جلد ہی اعلیٰ افسروں کی نظر میں آ گیا اور تیزی سے ترقی کرتے کرتے ڈی ایس پی کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس کے دوران کروڑوں کمائے اور لاکھوں لٹائے۔ جب حالیہ آپریشن کی وجہ سے گھیرا تنگ ہوتا محسوس کیا تو ریٹائرمنٹ لے لی۔ اس کے پاس کروڑوں اربوں کی جائیداد کے ساتھ کروڑوں اربوں نقد بھی تھے۔ ساری زندگی اوپر والوں کو تو خوش رکھا ہی تھا تبھی تو تمام اللّوں تللّوں کے باوجود باعزت ریٹائرمنٹ کی نعمت نصیب ہوئی۔ اب ریٹائرمنٹ کے بعد سب سے اوپر والے کو بھی راضی کرنے کا خیال آیا۔ واپس گاؤں میں آ کر ایک شاندار مسجد اور مدرسے کی بنیاد رکھی۔ پیسہ وافر تھا دیکھتے ہی دیکھتے 'اوپر والے' کا خوبصورت گھر اور غریب بچوں کی تعلیم کے لیے شاندار رہائشی مدرسہ وجود میں آ گیا۔ مولانا عاطف کیلانی، جو قریب کے علاقے کے معروف عالم دین ہیں، ان سے رابطہ کیا اور سرپرستی کی درخواست کی۔ بس پھر کیا تھا سبطین خاں کی دولت اور مولانا عاطف کیلانی کی طاقت لسانی، مدرسہ سبطینیہ کو چار چاند لگ گئے۔ راجہ سبطین اللہ والے مشہور ہو گئے اور علاقے کی بیبیاں ان سے دعا لینے اور سر پر ہاتھ پھرانے کے لیے حاضر ہونے لگیں۔ ایک آدھ دفعہ کراچی سے بدخبری آئی بھی تھی لیکن اب سب سے اوپر والے کو خوش کرنے کے بعد کسی کو بُری آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔

تبصرۂ کتب مدیر

مختصر تبصرۂ کتب

'ناموسِ رسالت اور آزادیٔ اظہار' از محمد متین خالد

مصنف ختمِ نبوت اور ناموسِ رسالت کے حوالے سے کئی کتابوں کے معروف مؤلف ہیں۔ مذکورہ موضوع بہت اہم ہے اور انہوں نے اس پر بڑی محنت سے قیمتی مواد جمع کیا ہے لیکن ۴۰۰ صفحات کی اس کتاب میں نہ فہرست موضوعات ہے اور نہ ابواب وفصول اور ذیلی عناوین ہیں جس سے قاری کے لیے کتاب سے فائدہ اٹھانا چنداں آسان نہیں۔ غالباً جلدی کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دی جاسکی۔ کتاب علم وعرفان پبلشرز، الحمد مارکیٹ ۴۰ اُردو بازار لاہور (042-37223584) سے منگوائی جاسکتی ہے۔

'اہلِ محبت واہلِ سلوک کے لیے قرآنی لائحۂ عمل' از حافظ محمد موسیٰ بھٹو

حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب ماہنامہ بیداری، حیدرآباد (اُردو۔سندھی) کے مدیر اور دینی وعصری موضوعات پر درجنوں مفید کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی فکر کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ فرد جب تک جہاد بالنفس کے ذریعے اپنا تزکیہ نہ کرے، دینا وآخرت میں فرد کی کامیابی یا معاشرے اور ریاست کی اصلاح ناممکن ہے۔ اس کے ساتھ وہ مغربی تہذیب کی تباہ کاریوں سے بھی اپنے قارئین کو آگاہ کرتے ہیں۔ حافظ بھٹو صاحب کے اس موقف میں ظاہر ہے، وزن ہے۔ کاش دینی طبقے، ملک کے پڑھے لکھے لوگ، نوجوان اور عوام حافظ صاحب کی ان باتوں پر غور کریں اور عمل کریں۔

زیر بحث کتاب میں حافظ صاحب نے مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر 'بیان القرآن' سے ان تفسیری نکات کو سہل انداز میں مرتب کردیا ہے جن کا متعلق تزکیہ اور اصلاح نفس ہے ۴۰۸ صفحات کی یہ کتاب سندھ نیشنل اکیڈمی (ٹرسٹ) ۴۰۰ بی۔ لطیف آباد ۴۔ حیدرآباد (سندھ) سے منگوائی جاسکتی ہے۔

'امت مسلمہ کے مستقبل کی تشکیل نو میں اہل قلم کا رول' از انجینئر مختار فاروقی

اس کتابچے میں مؤلف نے اہل قلم کو توجہ دلائی ہے کہ وہ امت کے مستقبل کی تشکیلِ نو

میں اپنا مثبت کردار ادا کریں۔ انجینئر صاحب قرآن اکیڈمی جھنگ کے روحِ رواں اور ماہنامہ حکمت بالغہ کے مدیر اور ان تھک لکھاری ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی فکر اور ان کے اداروں سے منسلک ہیں۔ ہم اور وہ نصرت دین کے ایک ہی قافلے کے ہدی خواں ہیں لیکن لگتا ہے ہماری قوم پر آسیب کا سایہ ہے جو ہماری قوتوں کو ثمر آور نہیں ہونے دے رہا۔ ویسے بھی ’’اہلِ قلم‘‘ شاید اب پیچھے رہتے جا رہے ہیں اور سوشل و الیکٹرانک میڈیا کا ابلیس سب پر غالب آ گیا ہے۔ اس طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ۲۴ صفحات کا یہ خوبصورت کتابچہ قرآن اکیڈمی، لالہ زار کالونی فیز II، ٹوبہ روڈ، جھنگ صدر (0336-6778561) سے منگوایا جا سکتا ہے۔

بقیہ: دینی سیاسی قوتوں کے لیے لائحہ عمل

تیسرا آپشن: ’’افراد‘‘ کے لیے

ہاں البتہ جب تک ان دونوں سمتوں پر ملک میں پیش رفت نہیں ہوتی، اور جو کہ فی الحال نہیں ہو رہی، تو اس وقتی مرحلے (transitional period) کے لیے (اور واضح رہے، صرف اس وقتی مرحلے ہی کے لیے) ہم تجویز دیں گے کہ:

عامۃ الناس (مین سٹریم) کے لیے پُرکشش (charismatic) ہو سکنے والے ہمارے کچھ باصلاحیت نفوس کے پاس یہ ایک آپشن رہ جاتا ہے کہ وہ یہاں کی مین۔سٹریم پارٹیوں میں ممکنہ حد تک اوپر پہنچنے کی کوشش کریں، اگرچہ وہ کچھ غیر مذہبی پارٹیاں کیوں نہ ہوں، جیسے مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف وغیرہ۔ جب تک آپ یہاں خود مین۔سٹریم نہیں بن سکتے اُس وقت تک اِن مین۔سٹریم پارٹیوں کو لبرل ایجنڈا برداروں کے حاوی ہونے کے لیے چھوڑ رکھنا ہماری رائے میں ہلاکت ہے۔ ان (غیر مذہبی) پارٹیوں کو شجرِ ممنوعہ جانتے ہوئے خاص مذہبی سیاست کے اندر محصور رہنا اندریں حالات درست نہ ہوگا (خصوصاً جبکہ مذہبی سیاست فی الوقت ایک بند گلی ہو اور اس کا منتہائے سعی چند سیٹیں۔ حقیقت یہی ہے، خواہ اسے آپ الفاظ میں لائیں یا چھپائیں)۔ واضح رہے ہم نے کہا دین پسندوں کا مذہبی سیاست کے اندر ’’محصور‘‘ رہنا ایک نادرست بات ہوگی۔ یہ نہیں کہا کہ مذہبی سیاست ’’کرنا‘‘ غلط ہے۔ جن علاقوں میں کوئی روایتی مذہبی جماعت کسی اچھی پوزیشن میں ہے وہاں اس کے پلیٹ فارم سے ہی سیاست میں سرگرم ہونا اس آپشن کا حصہ جانیے۔